پاکستانی ادب کے معمار

ڈاکٹر تحسین فراقی: شخصیت اور فن

ڈاکٹر طارق ہاشمی

اکادمی ادبیات پاکستان

پاکستانی ادب کے معمار

(سلسلہ ۱۵۴)

ڈاکٹر تحسین فراقی: شخصیت اور فن

پاکستانی ادب کے معمار

ڈاکٹر تحسین فراقی: شخصیت اور فن

ڈاکٹر طارق ہاشمی

اکادمی ادبیات پاکستان

پطرس بخاری روڈ، سیکٹر H-8/1، اسلام آباد

نگرانِ اعلیٰ : ڈاکٹر یوسف خشک
مدیرِ اعلیٰ : محمد عاصم بٹ
مصنف : ڈاکٹر طارق ہاشمی
نظرِ ثانی : تمکین مرزا
طباعت : اختر رضا سلیمی
اشاعت : 2021
تعداد : 500
ناشر : اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع : نسٹ پریس، اسلام آباد
قیمت : مجلد: -/300 روپے
غیر مجلد: -/260 روپے

ISBN: 978-969-472-480-5

Pakistani Adab Kay Maimar
Dr. Tehseen Firaqi: Shakhsiyat-aur-fun

Written By
Dr. Tariq Hashmi

Publisher
Pakistan Academy of Letters
Islamabad, Pakistan

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

فہرست

پیش نامہ

ڈاکٹر تحسین فراقی کا نام تنقید و تحقیق کے شعبے میں تو خاص قدر و منزلت کے حامل ہے لیکن اقبالیات کے حوالے سے بھی آپ کی تحریریں آپ کی علمی بصیرت اور گہرائی کی آئینہ دار ہیں۔ آپ شاعر بھی ہیں۔ تمام عمر اردو زبان و ادب کی تدریس کے شعبے سے وابستہ رہے۔ کچھ عرصہ معروف ادبی ادارہ مجلس ترقی ادب کی ڈائریکٹر بھی رہے۔

ترجمہ کا میدان ہو، شاعری کا تحقیق و تدوین اور تنقید کا شعبہ ہو، یا پھر تدریس کا سلسلہ ہو آپ کی خدمات کا سلسلہ ان تمام شعبوں تک دراز ہے۔ آپ کی زیر سربراہی محققین اور ناقدین کی ایک نسل نے تربیت پائی۔

آپ کی شاعری میں اردو کی کلاسیکی روایت کا رچاؤ موجود ہے، اور جدید طرز نگارش کی خوشبو بھی ملتی ہے۔ آپ کی وسعت مطالعہ، ریاضت اور ذخیرہ الفاظ نے آپ کی شاعری و دیگر نثری تحریروں کو قدر و منزلت کی اعلیٰ منزلوں پر فائز کیا۔

ڈاکٹر طارق ہاشمی، ڈاکٹر تحسین فراقی کے شاگردوں اور نیاز مندوں میں شامل ہیں، اور اس کتاب کو انھوں نے اپنی عقیدت مندی کے باوجود تنقید کے اعلیٰ معیارات کو پیش نظر رکھتے ہوئے تحریر کیا ہے۔ آپ خود بھی ایک شفیق استاد اور شاعر و نقاد ہیں۔ ان کی یہ کتاب ڈاکٹر تحسین فراقی کی ادبی خدمات کا فہم حاصل کرنے میں نہایت مدد و معاون ثابت ہوگی۔

اس کتاب کی تدوین، تزئین و آرائش اور طباعت کے لیے میں اپنے رفیق کار محمد عاصم

بٹ اور اختر رضا سلیمی کا بھی ممنون ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ کو حسبِ سابق اکادمی کی یہ کاوش بھی پسند آئے گی۔

ڈاکٹر یوسف خشک میریٹوریس پروفیسر
چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان
اسلام آباد۔

پیش لفظ

نہیں کہ کوہ کن و قیس کا زمانہ نہیں
مگر یہ بات کہ یہ لوگ خال خال ہوئے

ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس شعر میں سماج کی ایک ایسی تصویر دکھائی ہے جس سے معاشرتی زوال کا سبب کھل کر سامنے آتا ہے لیکن اپنے ارد گرد کی علمی و ادبی فضا کو دیکھا جائے تو ذاتی طور پر میرے لیے اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ فراقی صاحب نے اپنے شعر میں جن خال خال افراد کا ذکر کیا ہے، اُن معدودے چند لوگوں میں خود اُن کا بھی شمار ہوتا ہے۔ وہ تحقیق و تنقید کی دنیا کے کوہ کن ہیں اور تخلیقی سطح پر ایسے دشت کے قیس جو ایک دلِ دردمند رکھتے ہیں۔

اب سے ربع صدی قبل جب شعبۂ اُردو اورینٹل کالج لاہور کے احاطے میں بہ طور طالب علم داخل ہوا تو جن اساتذہ کی جامع علمی شخصیت نے نہایت متاثر کیا، ڈاکٹر تحسین فراقی اُن میں بہت معتبر ہیں۔ معاملاتِ شعر سے چونکہ میرا شغف زیادہ تھا لہٰذا اُستاذِ گرامی سے اس نسبت سے اور بھی زیادہ قربت نصیب ہوئی اور رموزِ سخن سیکھنے کے کشادہ مواقع دستیاب ہوئے۔

میرے لیے یہ امر سعادت کا باعث ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کے سلسلہ "پاکستانی ادب کے معمار" کے تحت مجھے اُن کی تخلیقی شخصیت کی تہذیبی جہتوں پر ایک ایسی دستاویز تیار کرنے کا موقع ملا جو میرے لیے اُن علمی اسباق کا آموختہ ثابت ہوئی جو میں نے ربع صدی قبل بیشتر اُن سے رو برو حاصل کیے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی تصانیف کے اس جامع مطالعے اور تجزیات سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا اور متعدد علمی نکات کی گرہ کشائی ہوئی۔

میں نے اپنی اس کاوش کو چار ابواب میں تقسیم کر کے اُن کے حالاتِ زندگی اور شخصیت کے ساتھ اُن کی شاعری، تحقیق و تنقید اور ترجمہ کاری کا جائزہ لیا ہے۔ اس سلسلے میں اُن کی تصانیف سے بہ طور اصل

مآخذ استفادہ کیا گیا۔ آخر میں چونکہ ناقدین کی آراء الگ سے درج کی گئی ہیں لہٰذا مباحث میں اُن کی کسی نوع کی رائے سے اعتنا نہیں کیا گیا۔ تاہم ڈاکٹر تحسین فراقی کے اُٹھائے ہوئے کسی تحقیقی پہلو پر اہلِ نظر نے بہ طور ایک بحث اگر اپنی آرا پیش کی ہیں تو انھیں یکجا کر کے ضرور درج کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں بھی انتخاب اور اختصار کو بہ طور خاص پیشِ نظر رکھا ہے۔

اپنی اس کاوش کی تکمیل میں مجھے کئی ایک اطراف سے بھرپور تعاون نصیب ہوا یہی وجہ ہے کہ اپنے کام کی بروقت تکمیل میں بہت سہولت ہوئی۔ اس سلسلے میں خود استادِ گرامی ڈاکٹر تحسین فراقی کا بہت ممنون ہوں۔ انھوں نے بعض تصانیف و دستاویزات کی فراہمی میں فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ ڈاکٹر شیر علی کے لیے حرفِ سپاس و دعا کہ جن کے ساتھ شاگردی اور آوارہ گردی ایسا امتزاجی تعلق ہے۔ اپنے شاگردانِ عزیز عبدالقدیر رضوی، ظفر اقبال اور محمد صفدر ضیائی کا شکر گزار ہوں کہ تلاش، ترتیب اور تصحیح کے بعض امور میں انھوں نے زبردست ہاتھ بٹایا۔ عبدالحفیظ کا شکریہ کہ کاغذ پر لکھے حروف کو کمپیوٹر کے شیشے میں خوبصورتی سے منتقل کیا۔

اپنے اس حرفِ آغاز کا اختتام شعبۂ اُردو اورینٹل کالج کے زمانۂ طالب علمی کی یاد آوری پر کر رہا ہوں اور اس کے لیے بھی استادِ گرامی ہی کے تخلیقی الفاظ پیکرِ شعری میں دست گیری کر رہے ہیں:

عجیب دن تھے کہ تھی پور پور وقفِ جمال
ستارے ڈھالتے ، قوسِ قزح بناتے ہوئے
سرورِ علم بھی تھا ، انبساطِ شوق بھی تھا
شباب چڑھتے ہوئے اور کتاب پاتے ہوئے

ڈاکٹر طارق ہاشمی

باب اوّل

ڈاکٹر تحسین فراقی ــــ احوال و آثار

ڈاکٹر تحسین فراقی اُردو زبان و ادب نیز دنیائے تدریس میں علمی تشخص اور تہذیبی و تخلیقی مساعی کی بنیاد پر یگانۂ روزگار فرد ہیں۔ شاعری، تنقید اور تحقیق کے ساتھ ساتھ ترجمے کے شعبے میں اُن کی خدمات گراں قدر ہیں۔ اُن کا شمار برصغیر کی عظیم درسگاہ جامعہ پنجاب لاہور کے شعبۂ اُردو کے ان اساتذہ میں ہوتا ہے جو علم و فضل کی علامت قرار پائے۔

پاکستانی ادب کی تعمیر میں اُن کا کردار ہمہ جہت اور ہمہ پہلو قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک تخلیق کار، نقاد اور محقق تو ہیں لیکن تدریس کے شعبے سے اُن کی بصیرت افروز نسبت سے قدرت حق نے اُن کو یہ بھی توفیق عطا کی ہے کہ پاکستانی ادب کے معماروں کی ایک نسل نے اُن کے سائے میں پرورش و پرداخت کا اعزاز حاصل کیا۔

آئندہ صفحات میں اُن کے علمی و ادبی خدمات کا مفصل جائزہ پیش کیا جائے گا لیکن اس سے قبل ضروری ہے کہ اُن کے بعض سوانحی و پیشہ ورانہ کوائف کو معروضی پیرائے میں ملاحظہ کر لیا جائے۔

خاندانی پس منظر

ڈاکٹر تحسین فراقی کے دادا شیخ محمد حسین حکمت کے پیشے سے وابستہ تھے جو طبیہ کالج دہلی سے فراغت کے بعد ۱۹۳۲ء میں موجودہ ہندوستان کے ضلع گورداس پور سے ملتان کے مضافاتی علاقے جہانگیر آباد میں آ بسے۔ مختصر دورانیے کے قیام کے بعد ساہیوال کے مضافاتی علاقے بصیر پور میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور تادمِ آخر طب کے شعبے سے وابستہ رہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کے والد محمود اختر اور تایا محمد اصغر نے اپنی تعلیم اسی علاقے میں مکمل کی۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کے گھر کا ماحول گہرے مذہبی رجحان کا حامل تھا۔ بالخصوص والدہ محترمہ صوم و صلوٰۃ

کی پابند تھیں اور والد بھی باقاعدگی سے دن کا آغاز تلاوت قرآن مجید سے ہی کیا کرتے تھے۔ رومی، سعدی، عطار اور اقبال کے کلام اور نظریات سے گہری رغبت تھی۔ عربی اور فارسی زبان و ادب سے خاصی شناسائی تھی بلکہ اردو میں شعر بھی کہا کرتے تھے۔ پیشے کے لحاظ سے تدریس کے شعبے سے وابستہ تھے۔ وہ خوش الحان تھے۔ قرآن مجید کی قرأت ان کا روز کا معمول تھا۔

اس کے علاوہ اقبال اور رومی کے کلام کے اکثر اشعار انھیں زبانی یاد تھے اور خوش الحان ہونے کے باعث ترنم سے جب اشعار پڑھتے تو خوش گوار ماحول جنم لیتا۔ ان کی پیشہ وارانہ ذمہ داریاں درس و تدریس سے متعلق تھیں لیکن شعر فہمی اور کسی حد تک شعر گوئی کے عنصر کو بھی ماند نہیں پڑنے دیا۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کی شخصیت میں علمی، ادبی اور مذہبی عناصر کی جمع آوری اسی فیض کے باعث ہے۔ وہ اپنے والد کی محبت اور قربت کے حوالے سے یوں بیان کرتے ہیں:

> "میرے والد شیخ محمود اختر صاحب بھی فارسی بہت اچھی جانتے تھے۔ عربی کی بھی شد بد تھی۔ اگرچہ وہ سکول ٹیچر تھے لیکن ان کا علمی و ادبی ذوق بہت اچھا تھا۔ کبھی کبھار شعر بھی کہتے تھے۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ میرے دینی اور ادبی مزاج کو بنانے میں میرے والد کا بڑا ہاتھ ہے۔"(۱۰)

ڈاکٹر تحسین فراقی کے والد کو سعدی، عطار، رومی اور اقبال کے افکار سے خاصا لگاؤ تھا۔ اقبال اور رومی کا خاصا کلام بھی از بر تھا۔ عربی اور فارسی شاعری سے رغبت کی وجہ سے ڈاکٹر تحسین فراقی کے ہاں بھی یہ دلچسپی نظر آنے لگی۔ خوش الحانی کا وصف بھی اپنے والد سے ہی وراثت میں ملا۔ ان کے والد بچپن ہی میں اُن سے اقبال کی نظمیں تحت اللفظ اور ترنم سے سنتے تھے اور پھر اس پر حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے اور ڈاکٹر تحسین فراقی کی نعت پڑھنے کی جانب رغبت بھی اسی ماحول کا فیضان ہے۔ اس علمی ماحول کے علاوہ ڈاکٹر تحسین فراقی کو اپنے والد سے ملنے والا مذہبی ماحول بھی ان کی شخصیت کی تعمیر میں کارفرما رہا ہے۔ ان کے والد کے ساتھ ساتھ والدہ بھی صوم و صلوٰۃ کی پابند تھیں۔ دونوں کے تلاوت قرآن مجید کے معمول کی وجہ سے ڈاکٹر تحسین فراقی بھی اپنے دن کا آغاز تلاوت قرآن مجید ہی سے کرتے ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کی والدہ کم تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود مطالعے کا شغف رکھتی تھیں۔ بالخصوص تلاوت قرآن مجید کا معمول تا دمِ مرگ قائم رہا۔ محض تین جماعتیں پڑھے ہونے کے باوجود نثر کی دیگر کتب بھی پڑھ لیا کرتی تھیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کے والد سکول مدرس تھے اور مالی حالت بہت مناسب نہ

تھی لیکن ان کی والدہ نے تنگ دستی کے دنوں میں بھی اپنے بچوں کی تربیت کے عمل کو متاثر نہیں ہونے دیا۔ ڈاکٹر تحسین فراقی "آتش زیر پا" مرتبہ آغا شیدا کاشمیری میں لکھتے ہیں:

> "شاید ہی اپنی زندگی میں میں نے ایسی صابرہ اور صابر خاتون دیکھی ہو۔ ایثار کا یہ عالم تھا کہ خود غریب ہونے کے باوجود مفلسوں اور ناداروں کی حتی الوسع مدد کرتی رہتی تھیں۔"(۲)

ڈاکٹر تحسین فراقی کے نانا عبدالحق بڑی چمڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ قیام پاکستان سے قبل ان کا قیام موجودہ ہندوستان کے صوبہ پنجاب کے شہر امرتسر سے تھا لیکن قیام پاکستان سے کچھ عرصہ قبل ہی وہ سارا خاندان چوکی منتقل ہو گیا اور یہاں بھی اسی کاروبار کو جاری رکھا۔ کاروباری معاملات بہتر ہونے کی وجہ سے خاندان کے مالی حالات خاصے بہتر تھے۔

نام اور پیدائش

ڈاکٹر تحسین فراقی کی پیدائش ۱۷ ستمبر ۱۹۵۰ء کو چوکی میں ان کے ننھیال میں ہوئی اور بچپن کے ابتدائی دن چوکی ہی میں گزارے۔ البتہ تعلیم کا آغاز بصیر پور سے ہی ہوا۔ والدین نے "منظور اختر" نام رکھا لیکن ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنے لیے قلمی نام "تحسین فراقی" منتخب کیا۔ شہرت کی بلندیوں پر اسی نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کا بچپن انتہائی سادہ ماحول اور قلیل وسائل میں گزرا ہے۔ والد سکول مدرس تھے۔ والدہ بہت کم پڑھی لکھی تھیں۔ مالی وسائل بہت محدود ہونے کی وجہ سے ایسے تمام مسائل درپیش تھے جو ہمارے ہاں دیہی پس منظر میں زندگی گزارنے والوں کو درپیش ہوتے ہیں۔ البتہ گھر کے علمی، ادبی اور مذہبی ماحول نے براہ راست ان کی شخصیت کو کئی دیگر جہتوں سے روشناس کرایا۔

ساہیوال کا نواحی علاقہ بصیر پور کم ترقی یافتہ تھا جہاں بسر کی جانے والی زندگی ان مسائل سے لبریز تھی جو پسماندہ طرز زندگی سے خاصہ ہوتے ہیں لیکن اس ساری تنگی میں بھی ڈاکٹر تحسین فراقی کو مشاہدے کے لیے خاصا سرو سامان میسر تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی کے ابتدائی برسوں میں اس ماحول اور اس سے متعلق دیگر تمام عوامل کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ دیہی تہذیب میں سرسبز و شاداب اور لہلہاتے کھیت ہوں یا مٹی سے لدے ہوئے کچے راستے، یہ تمام عناصر ڈاکٹر تحسین فراقی کے مشاہدے کا حصہ رہے ہیں۔

انھوں نے تھیٹروں یا راجباہوں میں تیراکی جیسے اشغال میں بھی حصہ لیا ہے۔ جب کہ دیہی ماحول میں منعقد ہونے والے میلے ٹھیلوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان عوامل سے منسلک ہونے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر تحسین فراقی کے لیے گھر کے ماحول سے منسلک اور اس سے متاثر ہونا بھی لازمی جزو تھا۔

ان میں قناعت پسندی کی صفت دراصل والدہ کی صابر طبیعت کی دین ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے بچپن بصیر پور کے گلی کوچوں میں ایسے گزارا ہے جیسے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے دیہی بچے گزارتے ہیں لیکن انھی امور کی وجہ سے ان کی شخصیت میں پختگی اور تیز مشاہدے کا وجود بھی ممکن ہوا۔

تعلیمی سفر

مالی آسودگی کے نہ ہونے کے باعث جہاں زندگی کی دیگر خواہشات کی تکمیل نہیں ہو پاتی، وہیں ادھوری تعلیم یا کٹھن مراحل سے گزرتی ہوئی تعلیمی ترتیب بھی متاثر ہوتی رہتی ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کا طالب علمی کا زمانہ بھی ایسے ہی کٹھن راستوں کا مسافر رہا ہے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے قصبے ہی سے حاصل کی۔ بصیر پور کے سادہ ماحول نے ان کی زندگی اور شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ انھوں نے مٹی سے وابستگی کو ہمیشہ یاد رکھا۔

۱۹۶۰ء میں پرائمری اور ۱۹۶۳ء میں مڈل کا امتحان درجہ اول سے پاس کیا۔ میٹرک کا امتحان ۱۹۶۶ء میں ڈسٹرکٹ بورڈ اسکول بصیر پور میں امتیازی نمبروں کے ساتھ درجہ اول میں پاس کیا۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت بصیر پور ہی میں ہوئی۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے جن سکولوں سے اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی ان میں کمرے کم ہونے کی وجہ سے زمین پر بیٹھ کر پڑھنا ایک مجبوری تھی لیکن یوں زمین پر بیٹھ کر پڑھنے اور پڑھانے والوں میں اخلاص کی بدولت تعلیم و تربیت کا حسین امتزاج پیدا ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر تحسین فراقی لاہور جیسے بڑے شہر میں منتقل ہونے کے بعد بھی اپنے بصیر پور کے سکولوں کو نہیں بھولے۔ اپنے زمانہ طالب علمی کے ابتدائی دنوں کے حوالے سے ڈاکٹر تحسین فراقی عارف ثاقب خان کو دیے گئے ایک مصاحبے میں بیان کرتے ہیں:

"میں نے ایک پڑھے لکھے ماحول میں آنکھ کھولی۔ والد اسکول میں مدرس تھے۔ رومی، عطار اور اقبال کے عاشق۔ خود شعر کہتے تھے۔ والدہ اگرچہ صرف تین جماعت پڑھی تھیں مگر قرآن حکیم اور نثر کی کتابیں ذرا اٹک اٹک کر پڑھ لیتی

تھیں۔۔۔مجھے اچھے اور فرض شناس اساتذہ ملے۔ ماسٹر حسن محمد، علامہ ولی محمد، حافظ بصیر پوری اور خود میرے والد۔ سب دردمند، بلند نگاہ اور اپنے اپنے مضمون میں طاق تھے۔"(۳)

سکول کے زمانہ طالب علمی میں اپنے والد محمود اختر کے علاوہ دیگر اعلیٰ پائے کے اساتذہ سے کسب فیض کا موقع ملتا۔ بالخصوص خوشخطی کے شوق کی تکمیل میں والد کے ساتھ ساتھ ماسٹر حسن محمد کی سرپرستی اور تربیت نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ادبی تعلیم کے حصول کے باب میں علامہ ولی محمد جب کہ عربی اور فارسی زبانوں سے شناسائی کے حوالے سے حافظ بصیر پوری جیسے اساتذہ کی تربیت اہم حوالہ ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کی اردو، عربی اور بالخصوص فارسی زبان سے رغبت کی وجہ ان کے والد اور دوسرے استاد، حافظ بصیر پوری کی تربیت ہے۔ حافظ بصیر پوری فارسی زبان وادب سے خاص شغف رکھتے تھے۔ اس طرح شعری ذوق ڈاکٹر تحسین فراقی کے مزاج کا بھی حصہ بننے لگا اور انھوں نے سکول کے زمانہ ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا۔

شعر فہمی اور شعر گوئی کی جانب رجحان کی بنیادی وجہ ان کی اپنے والد اور استاد حافظ بصیر پوری سے گہری وابستگی تھی۔ ان کے والد گاہے گاہے شعر کہا کرتے تھے اور حافظ بصیر پوری تو "گلستان" اور "بوستان" جیسی کتابوں کے مطالعہ پر خاصی دسترس رکھتے تھے۔ فارسی زبان وادب پر کمال دسترس کے حامل ان دو اساتذہ کی سرپرستی کی وجہ سے ڈاکٹر تحسین فراقی نے بھی شعر گوئی کا آغاز کر دیا۔ اس صورت حال کے متعلق وہ خالد ہمایوں اور احمد عطا کو دیے گئے ایک مصاحبے میں یوں بیان کرتے ہیں:

"مجھے اپنے استاد حافظ بصیر پوری صاحب سے "گلستان" اور "بوستان" سبقاً سبقاً پڑھنے کا موقع مل گیا۔ فارسی کا ذوق تو موجود تھا لیکن استاد محترم سے فارسی کتب پڑھنے کے بعد یہ ذوق مزید بڑھ گیا۔ میرے والد شیخ محمود اختر صاحب بھی فارسی بہت اچھی جانتے تھے۔ عربی کی بھی شد بد تھی اگرچہ وہ سکول ٹیچر تھے لیکن ان کا علمی وادبی ذوق بہت اچھا تھا۔ کبھی کبھار شعر بھی کہتے تھے۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ میرے دینی اور ادبی مزاج کو بنانے میں میرے والد کا بڑا ہاتھ ہے۔"(۴)

ڈاکٹر تحسین فراقی نے میٹرک تک دیگر مضامین میں اعلیٰ نمبر حاصل کر کے پاس ہونے کے ساتھ ساتھ اُردو اور فارسی زبان وادب سے بھی خاصی شناسائی حاصل کر لی تھی۔ پرائمری جماعتوں ہی سے شعر کہنے کی کوشش بھی شروع کر دی تھی لیکن میٹرک تک پہنچتے پہنچتے مناسب شعر کہنے لگ گئے تھے۔

مالی مسائل کے باوجود میٹرک سے آگے بھی تعلیم جاری رکھنے کا ارادہ مضبوط رکھا اور ایف اے کی تعلیم کے لیے لاہور کا رخ کیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں ان کے بڑے بھائی مقبول اختر بھی لاہور ہی میں زیرِ تعلیم تھے۔ مقبول اختر وزارت دفاع میں ایک بڑے عہدے پر اپنی خدمات پیش کر کے سبکدوش ہوئے اور چند سال بعد ہی راہی ملک بقا ہوئے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کی زندگی کے تعلیمی مراحل میں ان کی راہنمائی شامل حال رہی ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے ۱۹۶۸ء میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ سے ایف اے کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ انھیں لازمی مضمون انگریزی اور اختیاری مضمون تاریخ میں گہری دلچسپی تھی۔ اس دلچسپی کی بنیادی وجہ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کا تعلیمی ماحول اور وہاں کے جید اساتذۂ کرام تھے جن کی سرپرستی اور تربیت کی بدولت ڈاکٹر تحسین فراقی کو اردو، عربی اور فارسی کے بعد انگریزی زبان و ادب کے ساتھ تعارف اور پھر اس میں گہری دلچسپی کا موقع بھی میسر آیا۔ انگریزی زبان میں دلچسپی کے حوالے سے ڈاکٹر تحسین فراقی یوں بیان کرتے ہیں:

"ایف اے میں میں نے اکنامکس اور بی اے میں تاریخ پڑھی تھی۔ لیکن اصل بات تو یہ ہے کہ زبان کے ساتھ میرا فطری رجحان بچپن سے بن گیا تھا۔ میں نے اپنے بی اے کے زمانے میں انگریزی زبان و ادب کی کتابوں کا ڈٹ کر مطالعہ کیا۔"(۸)

ایف اے مکمل کرنے کے بعد ڈاکٹر تحسین فراقی نے اسلامیہ کالج سول لائنز سے بی اے کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ۱۹۶۹ء میں اسی کالج میں بی اے میں داخلہ لے لیا۔ سیکھنے کے جذبے کی بدولت وہاں بھی جید اساتذہ سے کسبِ فیض کا موقع ملا۔ انگریزی ادب کے دو بڑے اساتذہ راضیہ شبیہ اور ایرک سپرین سے وابستگی نے ڈاکٹر تحسین فراقی کی زندگی اور نظریات کو ایک اور سمت عطا کی۔ اسی دور میں انھیں اسپنسر اور چاسر کو پڑھنے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ ہیملٹ، رومیو اینڈ جولیٹ اور اوتھیلو سے تعارف بھی انھیں دنوں میں ہوا۔ بی اے کے دوران ہی شیکسپیئر کے ڈراموں میں گہری دلچسپی پیدا ہونے لگی اور ایز یو لائک اٹ، میکبتھ اور کنگ لیئر جیسے ڈرامے پڑھنے کا بھی موقع ملا۔ شیکسپیئر کو اس قدر دلچسپی سے پڑھنے کی ایک بنیادی وجہ ان کے نزدیک شیکسپیئر اور اقبال کے درمیان نظریات کا باہمی اشتراک ہے کیوں کہ اقبال شیکسپیئر کو اس کے نظریات اور فلسفیانہ تصورات کی وجہ سے قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ گویا اس دلچسپی کی بدولت ڈاکٹر تحسین فراقی نے شیکسپیئر کو بہت شوق سے پڑھنا شروع کر دیا۔ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں گزرے ایام کے حوالے سے ڈاکٹر تحسین فراقی بیان کرتے ہیں:

"چاسر اور اسپنسر کا منتخب مطالعہ انھی ایام میں کیا۔ شیکسپیئر کے ڈراموں کی چاٹ
لگی اور میکبتھ، ایز یو لائیک اٹ، کنگ لیئر اسی زمانے میں پڑھے۔ بعد ازاں
ہیملٹ، اوتھیلو اور رومیو اینڈ جولیٹ پڑھنے کا موقع ملا۔ شیکسپیئر کے حکیمانہ اقوال
اور اس کی شاعری نے بڑا متاثر کیا۔ اقبال نے اس کے بارے میں کیا [کس]
قدر درست کہا تھا:

حفظ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
رازداں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا(۲)

انگریزی زبان و ادب بالخصوص شیکسپیئر کو اس قدر جذبے سے پڑھنے کی ایک اور اہم وجہ چارلس اینڈ میری لیمب کی کتاب "ٹیلز فرام شیکسپیئر" بھی تھی۔ اس کتاب میں شیکسپیئر کے فن پاروں کی بہ صورت نثر موجودگی نے ڈاکٹر تحسین فراقی کو اس جانب سے لا کے رکھا۔ اس کے حوالے انھوں نے انگریزی زبان پر دسترس حاصل کرنے کے لیے اقبال کے خطبات کا بھی مطالعہ شروع کر دیا۔ اس دور میں لاہور میں بعض مغربی باشندوں کی آمد و رفت زیادہ ہونے سے ڈاکٹر تحسین فراقی کو ان کے ساتھ گفتگو کے بھی کئی مواقع میسر آنے لگے۔ ان کے ساتھ بول چال سے ڈاکٹر تحسین فراقی کی انگریزی بولنے کی صلاحیت بھی بڑھنے لگی۔

انگریزی زبان و ادب اور اس سے وابستہ فلسفیانہ افکار میں گہری دلچسپی اور انھیں سیکھنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع دستیاب ہونے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر تحسین فراقی کو اردو زبان و ادب کی نمائندہ شخصیات سے بھی ملنے کا موقع ملتا رہا۔ شہرت بخاری، عابد علی عابد، قیوم نظر اور شورش کاشمیری جیسی قد آور ادبی شخصیات سے ملاقات اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں ایف اے کرنے کے دوران ہی ہوئی۔ علم و ادب سے اس قدر رغبت اور محبت ہونے کے باوجود گھریلو مسائل بالخصوص مالی وسائل کی کمی کی وجہ سے انھیں اپنی بی اے کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر واپس قصبہ آنا پڑا۔

اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور سے بی اے کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر واپس بصیر پور آ گئے اور اپنے استاد حافظ بصیر پوری سے "گلستان" اور "بوستان" سبقاً سبقاً پڑھیں۔ یوں پھر سے فارسی زبان و ادب سے مزید شناسائی ممکن ہونے لگی۔ لیکن فارسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے انگریزی زبان کے ساتھ بھی دلچسپی اور لا کو قائم رکھا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے علامہ اقبال کے انگریزی خطبات کا مطالعہ مسلسل اور مستقل بنیادوں پر شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ وہ اس دور کے معروف اخبار "پاکستان ٹائمز" کے

اداریوں کے مطالعے کو بھی اپنا معمول بنا لیا۔ یوں اردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی زبان و ادب میں
ڈاکٹر تحسین فراقی کی دلچسپی بڑھنے لگی۔

فارسی زبان و ادب سے آشنائی کے مواقع تو بچپن ہی سے ملتے رہے البتہ انگریزی زبان و ادب
کے حوالے سے ڈاکٹر تحسین فراقی ذاتی دلچسپی کے ساتھ ترقی کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ اس ضمن میں
وہ یوں بیان کرتے ہیں:

"علامہ اقبال کے انگریزی خطبات کا مطالعہ بھی اسی زمانے میں شروع کیا۔
انگریزی کی استعداد بڑھانے کے لیے میں اس زمانے میں "پاکستان ٹائمز" اور
خصوصاً اس کے اداریوں کا مطالعہ کرتا تھا۔"(۷)

مالی مسائل کی وجہ سے بی اے کی ادھوری تعلیم کی تکمیل کے لیے پھر سے کوشاں ہونے لگے اور بالآخر
بکھرے جذبات اور توانائیوں کو یکجا کر کے ۱۹۶۷ء میں بی اے کا امتحان پرائیویٹ امیدوار کے طور پر دینے کا
فیصلہ کر لیا۔ اس قدر پریشانی کے باوجود ۱۹۶۷ء میں بی اے کا امتحان درجہ اول میں پاس کر لیا۔ بی اے کا
امتحان پاس کرنے کے فوری بعد وہ واپس لاہور آ گئے اور وہاں سنٹرل ٹریننگ کالج میں بی ایڈ میں داخلہ لے
لیا۔ اسی سال ۱۹۷۱ء میں بی ایڈ کا امتحان بھی اعلیٰ نمبروں سے پاس کر کے مزید تعلیم جاری رکھنے کا عہد کر لیا۔
بی ایڈ کے فوری بعد تو مزید تعلیم حاصل نہ کر سکے جب کہ بی اے کے بعد ایم اے انگریزی کی خواہش کے علی
الرغم ۱۹۷۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بطور پرائیویٹ امیدوار ایم اے اردو کا امتحان پاس کر لیا۔

ایم اے کے اردو کے دیگر پرچوں کے بالمقابل اقبالیات کے مضمون کے نمبر سب سے زیادہ تھے
اور ان پرچوں کی جانچ معروف اقبال شناس پروفیسر مرزا محمد منور نے کی تھی۔ ایم اے اردو بھی بہت
نمایاں نمبروں سے مکمل کیا اور اپنے بڑے بھائی مقبول اختر کی ہدایت کے مطابق ۱۹۷۷ء میں پنجاب
یونیورسٹی سے ایم ایڈ کا امتحان پاس کر لیا۔ ایم اے اردو کرنے سے پہلے ڈاکٹر تحسین فراقی کا ارادہ ایم اے
ا ⓫ کرنے کا تھا لیکن ان کے بھائی نے انھیں بی ایڈ اور پھر ایم ایڈ کرنے کا مشورہ دے دیا تھا۔ اس
حوالے سے ڈاکٹر تحسین فراقی یوں بیان کرتے ہیں:

"بی اے کے بعد اردو ایم اے انگریزی کرنے کا قصد میں اپنے بڑے بھائی مقبول اختر
صاحب کے پاس لاہور آیا۔ وہ حال ہی میں منسٹری آف ڈیفنس سے ریٹائر ہوئے
ہیں۔ انھوں نے کہا کہ انگریزی میں ایم اے کر کے کیا کرو گے بی ایڈ کر لو۔"(۸)

بی ایڈ اور ایم ایڈ کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے حصول کے لیے مقالہ بہ عنوان ''عبدالماجد دریابادی: احوال و آثار'' ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۵ء کو پنجاب یونیورسٹی لاہور میں جمع کروایا گیا اور وہ ۱۹۸۶ء میں ڈاکٹریٹ کی سند سے سرفراز ہوئے۔ آپ کے مقالے کے نگران کار ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا تھے۔

ازدواجی زندگی

ڈاکٹر تحسین فراقی کی ازدواجی زندگی کا آغاز مارچ ۱۹۷۵ء میں ہوا۔ محترمہ رابعہ تحسین ان کی شریکِ حیات ہیں۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں اولاد میں شامل ہیں۔ عمر فاروق سب سے بڑا بیٹا تھا جو ۷ مارچ ۲۰۰۸ء کو اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس سے چھوٹی ایک بیٹی طیبہ تحسین ہے۔ جب کہ طیبہ تحسین سے چھوٹا بیٹا عثمان نوید ہے۔ حکمِ الٰہی سے یہ بیٹا بھی ۳۱ اگست ۲۰۱۸ء کو حرکتِ قلب بند ہونے سے زندگی کی بازی ہار گیا۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کی سب سے چھوٹی بیٹی کا نام حمیرا تحسین ہے۔ تحسین فراقی کی دونوں بیٹیاں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔

تدریسی سفر

ڈاکٹر تحسین فراقی نے ۱۹۷۱ء میں میونسپل کمیٹی لیہ کے ہائی سکول میں انگریزی زبان کے استاد کے طور پر اپنی پیشہ وارانہ ذمہ داری کا آغاز کیا لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد پائلٹ سکول شرقپور میں تدریسی خدمات کا آغاز کر دیا۔ وہاں صرف ایک سال تک پڑھایا۔ لیہ میں قیام کے دوران میں ڈاکٹر تحسین فراقی کی وہاں کی ادبی شخصیات سے خاص ملاقاتیں رہیں۔ ان ادبی شخصیات میں نافع کرنالی، نذیر چودھری اور نسیم لیہ جیسے شعرا شامل تھے۔ لیہ اور شرقپور میں مختصر دورانیے کی تدریسی مصروفیت کے بعد پنجاب پبلک سروس کمیشن کا زبانی امتحان پاس کرنے کے بعد ایم اے او کالج لاہور میں بطور لیکچرار تدریسی فرائض انجام دینے شروع کر دیے۔ اس دور میں ایک ایسے امیدوار کے لیے انٹرویو میں سرخرو ہونا اور اس میں کامیاب ہونا نہایت ہی مشکل تھا جس نے پرائیویٹ ایم اے کر رکھا ہو۔ لیکن ڈاکٹر تحسین فراقی نے نہ صرف یہ امتحان پاس کیا بلکہ تیس سیٹوں کے لیے آئے ہوئے سینکڑوں امیدواران میں اوّل بھی رہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی اپنی پہلی تقرری اور انٹرویو کے حوالے سے یوں بیان کرتے ہیں:

"پنجاب پبلک سروس کمیشن سے بطور Ⓛرار اردو انتخاب ہوا۔ اس سال اُردو
کے سینکڑوں امیدواروں نے انٹرویو دیا تھا۔ میں ان سب میں اوّل آیا تھا۔
چنانچہ میرا تقرر گورنمنٹ ایم اے او کالج لاہور میں ہوا۔"(۶)

گورنمنٹ کالج لاہور میں Ⓛرار کی آسامی خالی نہ ہونے کی وجہ سے ان کا تقرر ایم اے او کالج لاہور میں ہوا۔ وہاں ان کے رفقا کار میں عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد، محمد احسان الحق اور حفیظ صدیقی جیسی علمی و ادبی شخصیات شامل تھیں۔

Ⓛرشپ کے آغاز کے کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر تحسین فراقی ترقی پا کر اسسٹنٹ پروفیسر ہو گئے۔ لاہور کے کسی کالج میں بھی اسسٹنٹ پروفیسر کی آسامی خالی نہ ہونے کی وجہ سے انھیں پیرمحل کے نواحی علاقے فرید آباد کے ڈگری کالج میں اپنی تدریسی سرگرمیوں کو جاری رکھنا پڑا۔ فرید آباد میں تدریسی مصروفیات کے دوران ہی میں اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور میں اُن کا بہ طور Ⓛرار انتخاب ہوا اور انھوں نے کالج کی نوکری چھوڑ کر یہاں اپنی تدریسی خدمات پیش کرنا شروع کر دیں۔ ۲۳ نومبر ۱۹۸۲ء میں بہ طور Ⓛرار ہونے والی تقرری کا سفر بہ طور صدر شعبہ ۱۹ ستمبر ۲۰۱۰ء میں ملازمت سے ریٹائرمنٹ تک جاری رہا۔

بہ طور صدر شعبہ اُردو اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ریٹائرمنٹ کے بعد ۱۹ ستمبر ۲۰۱۰ء سے مارچ ۲۰۱۳ء تک دائرۂ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے بہ طور پروفیسر وابستہ ہوئے۔ ۱۸ مارچ ۲۰۱۳ء کو انھوں نے اس ذمہ داری سے الگ ہو کر پاکستان کے معروف اشاعتی اور ادبی خود مختار ادارے مجلس ترقی ادب لاہور کے ناظم کی حیثیت سے ذمہ داریاں سنبھال لیں اور تاحال یہ ذمہ داری نبھا رہے ہیں۔

بیرونِ ملک تدریسی ذمہ داریاں

تہران یونیورسٹی کے شعبہ اُردو کے لیے وزارتِ تعلیم حکومت پاکستان کی جانب سے ڈاکٹر تحسین فراقی کو تین سال کے عرصے کے لیے اردو اور مطالعہ اقبال کی مسند پر بطور استاد ایران بھیجا گیا۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے ۳ فروری ۲۰۰۵ء سے ۱۱ فروری ۲۰۰۹ء تک ایران میں تدریسی فرائض سرانجام دیے۔ وہاں قیام کے دوران ڈاکٹر تحسین فراقی نے جن دو امور پر خصوصی توجہ دی ان میں ایک وہاں کے ایرانی طلبہ کو اردو زبان و ادب کے علاوہ مطالعہ پاکستان اور پاکستانی ثقافت کی تدریس کی ذمہ

داری شامل تھی۔ جب کہ دوسرا عمل ایران کی دوسری جامعات بالخصوص ان کے شعبہ اُردو کو موثر بنانے کے لیے حکمت عملی کا تعین کرنا شامل کیا۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے ایران میں قیام کے دوران ایرانی تہذیب اور وہاں کے باشندوں کو بھی بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ انھوں نے ایرانی تہذیب و ثقافت کو بہت قریب سے دیکھا۔ بالخصوص ان کی کتاب سے محبت نے ڈاکٹر تحسین فراقی کو خاصا متاثر کیا۔ ایران میں بطور استاد ذمہ داریاں ادا کرنے کے بعد ڈاکٹر تحسین فراقی ۱۱ فروری ۲۰۰۸ء پاکستان لوٹے اور دوبارہ اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور میں شعبہ اُردو کے صدر کی حیثیت سے ذمہ داریاں ادا کرنا شروع کر دیں۔

علمی و ادبی کاوشیں اور سرگرمیاں

انسانی وجود میں مزاج ایک ایسا عنصر ہے جس کا قیام روزِ اول سے رہتا ہے۔ معاشرے کا کوئی فرد جس مزاج کا مالک ہوگا اس کے عمل اور ردِ عمل بھی اسی نوعیت اور نفسیات کے تابع ہوں گے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے بچپن ہی سے اردو زبان و ادب سے گہری دلچسپی رکھی تھی۔ اسی مزاج کے باعث وہ اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے ہمیشہ سرگرم رہتے تھے۔ تدریسی، انتظامی اور تخلیقی حوالوں سے ان کی حکمت عملی کے تحت مربوط سرگرمیاں ہمیشہ سے جاری رہی ہیں۔ بالخصوص اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ان کی بطور استاد وابستگی نے اورینٹل کالج کے علمی ماحول کو مزید مستحکم کرنے میں بہت مثبت کردار ادا کیا ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے بطور چیئرمین شعبہ اُردو، اُردو زبان و ادب کی احیا اور تشکیل کے لیے نصاب میں تبدیلی یا ترمیم کو لازمی تصور کیا تھا جیسے ایم اے اردو کے نصاب میں کلاسیکی عالمی ادب کو بھی شامل کیا گیا۔ اسی طرح انھی کے صدر شعبہ ہونے کے دوران فارسی اور عربی کا پرچہ بھی شامل نصاب کیا گیا۔ ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر لکھے جانے والے مقالہ جات کے موضوعات میں انھوں نے ہمیشہ اردو اور دیگر ادب کے تقابلی رجحانات پر مبنی موضوعات کو سراہا ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے بطور صدر شعبہ ۲۰۱۰ء میں "آزاد صدی" کی نسبت سے ایک بین الاقوامی سیمینار کا انعقاد بھی کیا۔ اس بین الاقوامی کانفرنس میں پاکستان کے علاوہ دیگر ممالک سے مہمانوں نے شرکت کی جن میں انڈیا، ایران، جاپان اور ترکی سے تعلق رکھنے والے افراد شامل ہیں۔ آپ نے جامعہ پنجاب کی لائبریری میں موجود کتب کے ذخیرے کو مزید زرخیز کرنے کی حکمت عملی بنائی۔ آزاد صدی کے بعد لائبریری

میں ذخیرہ آزاد کے عنوان سے ایک الگ حصے کا تعین کیا گیا اور ان کی مشرح فہرستیں شائع کیں۔ اسی دور میں آپ نے ن م راشد پر لکھے گئے اہم مقالات کو یکجا کر کے "کس دھنک سے مرے رنگ آئے" کے نام سے شائع کروایا۔ اسی طرح ایران میں ن م راشد کے ساتھ ہونے والے مصاحبوں اور چند دیگر دستاویزات و تنقیدات پر مشتمل ایک کتاب "حسن کوزہ گر" کے نام سے شائع کی گئی۔ ن م راشد کی وفات سے منسوب صد سالہ یوم ولادت کے موقعے پر جامعہ کے تحقیقی [illegible] "بازیافت" کو ن م راشد نمبر کے طور پر شائع کیا گیا۔

اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ اردو سے ریٹائرمنٹ کے بعد ڈاکٹر تحسین فراقی نے دو سال کا عرصہ دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں بطور پروفیسر اپنی خدمات سرانجام دیں۔ اس دوران بھی آپ نے اپنی تحقیقی سرگرمیوں کو ماند نہیں پڑنے دیا۔

۲۰۱۳ء سے مجلس ترقی ادب لاہور سے وابستگی کے بعد بھی آپ نے اردو زبان وادب کی ترقی کے لیے بہت کام کیا ہے۔ جدید فکری مباحث اور جدید اصناف ادب کی اشاعت کے ساتھ ساتھ انھوں نے کلاسیکی ادب کی اشاعت کو اولیں ترجیح دی ہے۔ انھوں نے ۲۰۱۴ء میں شبلیؒ کے صد سالہ یوم وفات کی نسبت سے نہ صرف ان کی معرکۃ الآرا تصنیف "سوانح مولانا روم" کو حواشی اور تعلیقات کے ساتھ شائع کیا بلکہ شعرالعجم کو بھی تصحیح متن اور مفصل حواشی کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ مجلس ترقی ادب کے [illegible] "صحیفہ" کے بھی حالی وشبلی نمبر اور مکاتیب نمبر شائع کیے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے اردو زبان وادب کی ترویج کے لیے اہم کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے نہ صرف ایران میں قیام کے دوران ایرانی طلبہ کو اردو زبان وادب کے ساتھ ساتھ معاشرہ پاکستان سے بھی روشناس کروایا بلکہ ایران کے تین اساتذہ نے ان کی نگرانی میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے اردو میں پی ایچ ڈی بھی کی ہے۔

منصبی مصروفیات

ڈاکٹر تحسین فراقی نے جو پیشہ ورانہ امور اور خدمات دوران تدریس سرانجام دیں اور مختلف اوقات میں جن مناصب پر فائز رہے ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

موجودہ مصروفیت: ناظم مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۸ مارچ ۲۰۱۳ء تا حال

پروفیسر: دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور ۲ سال تک خدمات

سرانجام دیں (۱۵/۱ اکتوبر ۲۰۱۰ء تا ۱۵/۱ اکتوبر ۲۰۱۲ء)

صدر شعبہ: صدر شعبہ اردو، یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور:
۲۵ مارچ ۲۰۰۸ء تا ۱۹ ستمبر ۲۰۱۰ء

مہمان پروفیسر: صدر اردو و پاکستان شناسی، دانش کدۂ زبان ہائے خارجی
دانشگاہ تہران، ایران: ۳۰ فروری ۲۰۰۵ء تا ۱۱ فروری ۲۰۰۸ء

صدر شعبۂ اردو: شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور
(۱) ۵ جولائی ۲۰۰۳ء تا ۲ فروری ۲۰۰۵ء
(۲) ۵ جولائی ۲۰۰۱ء تا ۲ مارچ ۲۰۰۳ء

پروفیسر (اردو): ۲۰ فروری ۲۰۰۸ء تا ۱۹ ستمبر ۲۰۱۰ء
۲۰ اپریل ۲۰۰۲ء تا ۳ فروری ۲۰۰۵ء

ایسوسی ایٹ پروفیسر (اردو): ایضاً، ۹/۱۲ اگست ۱۹۹۵ء تا ۲۰ اپریل ۲۰۰۲ء

اسسٹنٹ پروفیسر (اردو): ایضاً ۲۲ ستمبر ۱۹۸۸ء تا ۹/۱۲ اگست ۱۹۹۵ء

①ر (اردو): ایضاً ۲۲ نومبر ۱۹۸۴ء تا ۲۲ ستمبر ۱۹۸۸ء

①ر (اردو): گورنمنٹ ایم اے او کالج، لاہور: ۹ مئی ۱۹۸۴ء تا ۱۹۸۴ء

امتیازات و اعزازات

ڈاکٹر تحسین فراقی کی علمی، ادبی، تخلیقی، تدریسی، تنقیدی اور تحقیقی خدمات کا اعتراف قومی اور بین الاقوامی سطح پر کیا گیا۔ ان کے امتیازات اور ان کی خدمات کے اعتراف میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر انھیں جن "اعزازات" سے نوازا گیا اُن کا مختصر احوال ملاحظہ ہو:

۱۔ مڈل سے ایم اے تک تعلیمی امتحانات میں تسلسل کے ساتھ فرسٹ کلاس کا حصول۔
۲۔ نقوش ایوارڈ (برائے تنقید): ۱۹۹۳ء، عنوان مقالہ: علامہ اقبال اور مسلم نشاۃ ثانیہ۔
۳۔ ایسوسی ایٹ ایڈیٹر، ماہی اقبال (بزم اقبال، لاہور): ۱۹۹۳ء، ۱۹۹۵ء۔
۴۔ اے بی آئی (امیریکن بائیوگرافیکل انسٹی ٹیوٹ، کیلی فورنیا، امریکہ) کی جانب سے "مین آف دی ایئر" (Man of the year) کا اعزاز: ۱۹۹۷ء۔

۵۔ وزیر اعظم پاکستان ادبی انعام:۱۹۹۹ء۔

۶۔ قومی صدارتی اقبال ایوارڈ، ۱۹۹۷ء-۱۹۹۹ء، (اقبال: چند نئے مباحث پر بموقع افتتاحی اجلاس چار (۴) روزہ بین الاقوامی اقبال کانفرنس: ۱۱-۱۴ اپریل ۲۰۰۳ء۔ یہ ایوارڈ ایک طلائی تمغے اور مبلغ پچاس ہزار روپے نقد پر مشتمل تھا۔

۷۔ فکر اقبال کی اشاعت کے اعتراف میں ذکی یادگاری میڈل دیا گیا، ۲۰۰۹ء۔

۸۔ دانش نامۂ ادب فارسی (برعظیم پاک و ہند میں فارسی زبان و ادب کے لیے خدمات انجام دینے والے علما کا دائرۃ المعارف)۔ تین جلدیں۔ تہران، ۲۰۰۱ء۔ ان میں ڈاکٹر تحسین فراقی کا ذکر بھی موجود ہے۔

۹۔ "پرائیڈ آف پرفارمنس" ایوارڈ ۲۰۱۰ء، حکومت پاکستان۔ علمی و ادبی خدمات کی اہمیت و افادیت اور زبان و ادب میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر ان اعزازات کا عطا کیا جانا ڈاکٹر تحسین فراقی کی خدمات کا بیّن ثبوت ہے۔

۱۰۔ عالمی مجلس فروغ اُردو ادب دوحہ قطر کے جیوری ایوارڈ ۲۰۱۹ء سے نوازا گیا ہے۔

بیرون ملک علمی مجالس میں شرکت

ڈاکٹر تحسین فراقی بیرون ممالک اُردو کی ترویج و ترقی اور اس سے متعلقہ مختلف مجالس، کانفرنسوں اور سیمیناروں میں بھی شرکت کرتے رہے۔ اس دوران انھوں نے مختلف مواقع پر خطبات، مقالات اور مضامین پڑھے جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ بھارت — ۱۶ تا ۱۸ اکتوبر ۱۹۸۹ء: عالمی رابطۂ ادب اسلامی بین الاقوامی سیمی نار، منعقدہ حیدر آباد دکن (آندھرا پردیش)۔ موضوع مقالہ: برعظیم کی فکری آزادی میں اکبر کا کردار۔

۲۔ ایران — جون ۱۹۹۱ء، بین الاقوامی نظامی گنجوی سیمی نار، زیر اہتمام تبریز یونیورسٹی، ایران۔ موضوع مقالہ: تاثیر و نفوذ نظامی در ادبیات اردو۔

۳۔ بھارت — جون ۱۹۹۷ء: "اقبال کے فکروفن کی جہات" پر بین الاقوامی سیمی نار، زیر اہتمام دہلی یونیورسٹی دہلی۔ موضوع مقالہ: علامہ اقبال اور مسلم ثقافت کے خدوخال۔

۴۔ بلجیم — ۱۸، ۱۹ نومبر ۱۹۹۷ء: دو روزہ بین الاقوامی اقبال سیمپوزیم، منعقدہ گینٹ (Ghent)،

زیر اہتمام اقبال فاؤنڈیشن یورپ۔ موضوعِ مقالہ: "Man Versus Universe---- Iqbal's Perception"

۵۔ بھارت: ۱۷تا۱۹ نومبر ۲۰۰۰ء: بین الاقوامی مرزا محمد رفیع سودا کانفرنس، زیر اہتمام: غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی۔ موضوعِ مقالہ: عبرۃ الغافلین اور سودا کے شعری تصورات۔

۶۔ ایران: ۲۷ اپریل ۲۰۰۶ء: زیر اہتمام: گروہ اردو، دانشکدہ زبانہای خارجی، دانشگاہ تہران۔ موضوعِ مقالہ: اقبال کی شاعری میں حرکت و حرارت کے عناصر۔

۷۔ ایضاً: ۳۰ نومبر ۲۰۰۶ء، دو روزہ بین الاقوامی "عرس بیدل"، زیر اہتمام: کانون ادبیات ایران، تہران۔ موضوعِ مقالہ: اندیشۂ بیدل از دیدگاہ علامہ اقبال لاہوری

۸۔ ایضاً: ۳ دسمبر ۲۰۰۶ ایک روزہ اقبال سیمی نار۔ زیر اہتمام: مرکز پژوہشی میراث مکتوب، تہران۔ عنوان مقالہ: تاثیر مولوی در اندیشۂ علامہ محمد اقبال لاہوری۔

۹۔ جاپان: ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز جاپان کی تین روزہ بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کی اور "ایران میں تدریسِ اردو کی صورتِ حال اور مسائل" کے زیرِ عنوان مقالہ پڑھا۔

۱۰۔ ایران: ۵/ مئی ۲۰۱۰ء کو تہران یونیورسٹی کے زیر اہتمام سیمی نار میں شرکت۔ عنوان مقالہ: اقبال اور اتحادِ عالم اسلام۔

۱۱۔ بھارت: ۹/ ستمبر تا ۱۱/ ستمبر ۲۰۱۳ء، بین الاقوامی سیمی نار، زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی۔ موضوعِ مقالہ: "اردو زبان کے ارتقا میں مجلس ترقی ادب کا حصہ"

۱۲۔ ایضاً: فروری ۲۰۱۶ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام بین الاقوامی سیمینار (منعقدہ ۵-۷ فروری ۲۰۱۶) میں شرکت کی اور "عبدالماجد دریابادی۔ بااصول صحافت کا صاحبِ اسلوب علمبردار" کے زیرِ عنوان مقالہ پڑھا۔

۱۳۔ ماریشس: تین روزہ بین الاقوامی کانفرنس منعقدہ ۲۵-۲۷ نومبر ۲۰۱۵ (زیر اہتمام اردو اسپیکنگ یونین، ماریشس) میں شرکت کی اور "عالمیت کی صورتِ حال اور اردو کی معنویت" کے عمومی عنوان کے تحت "اردو بطور اعلیٰ ذریعہ تعلیم" پر مقالہ پڑھا۔

۱۴۔ افغانستان: مولانا جلال الدین رومی پر مزار شریف میں منعقدہ تین روزہ بین الاقوامی سیمینار (۲۳، ۲۴ اگست ۲۰۱۶) میں شرکت کی اور "اقبال اور رومی" کے زیرِ عنوان مقالہ پڑھا۔

۱۵۔ ایران: شمس تبریز پر منعقدہ سہ روزہ کانفرنس بمقام خوئی میں شرکت کی اور کلیدی مقالہ نگار کی حیثیت، "Shams & Rumi - Commonalities and Distinctions" کے زیر عنوان انگریزی میں مقالہ پڑھا۔

۱۶۔ دوحہ، قطر: مجلس فروغ اُردو ادب، دوحہ قطر کے سمپوزیم منعقدہ ۱۴–۱۵ نومبر ۲۰۱۸ء میں شرکت کی اور "ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کی علمی خدمات" کے زیر عنوان مقالہ پڑھا۔

اندرون ملک بین الاقوامی علمی مجالس میں شرکت

ڈاکٹر تحسین نے بیرون ملک عالمی مجالس کے ساتھ ساتھ مختلف اوقات میں اندرون ملک ہونے والی علمی و ادبی مجالس اور علمی مذاکروں میں بھی شرکت کی جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ ۷، ۸ نومبر ۱۹۹۶ء، دو روزہ بین الاقوامی اقبال سیمی نار، زیر اہتمام: خانۂ فرہنگ ایران، لاہور۔ عنوان مقالہ: فکر اقبال اور مغربی تمدن کی یلغار۔

۲۔ ۲۴، ۲۵ اکتوبر ۱۹۹۷ء، دو روزہ بین الاقوامی سیمی نار، زیر اہتمام: عالمی رابطۂ ادب اسلامی، لاہور۔ عنوان مقالہ: اردو کا ایک بے مثل سفرنامۂ حج۔

۳۔ ۹، ۱۰ نومبر ۱۹۹۸ء، علامہ اقبال تھرڈ انٹرنیشنل کانفرنس، زیر اہتمام: پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ عنوان مقالہ: نیا نظام عالم اور فکر اقبال۔

۴۔ ۳ فروری ۲۰۰۲ء، ایک روزہ بین الاقوامی کانفرنس، زیر اہتمام: ایرانی قونصلیٹ، اسلام آباد۔ عنوان مقالہ: ایران و پاکستان کے ثقافتی مشترکات (ادب کے حوالے سے)۔

۵۔ ۲، ۳ جنوری ۲۰۰۳ء، دو روزہ بین الاقوامی سیمی نار، بہ سلسلہ صد سالہ تقریبات انجمن ترقی اردو، زیر اہتمام: انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی۔ عنوان مقالہ: اردو بہ حیثیت ذریعہ تعلیم۔

۶۔ ۱۳ مارچ ۲۰۰۳ء، دوسری سہ روزہ سارک کانفرنس، لاہور۔ شرکت بطور مندوب۔

۷۔ ۸ دسمبر ۲۰۰۵ء، ایک روزہ بین الاقوامی سیمی نار، زیر اہتمام: شعبۂ فارسی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ عنوان مقالہ: ایران میں اقبال شناسی کے دس سال (۱۹۹۵–۲۰۰۵)

۸۔ ۷ اگست ۲۰۰۶ء، ایک روزہ لیو پولڈ محمد اسد سیمی نار، زیر اہتمام: اقبال اکادمی پاکستان، بہ اشتراک دی ٹروتھ سوسائٹی، لاہور۔ عنوان مقالہ: اسد کا قصہ طولانی ہے لیکن مختصر یہ ہے۔

علاوہ ازیں ڈاکٹر تحسین فراقی ملک کے درج ذیل معروف اور اہم علمی اداروں کے زیرِ اہتمام منعقدہ تقریباً ساٹھ (۶۰) علمی و ادبی مجالس اور علمی مذاکرات میں شرکت کر چکے ہیں، جن میں متنوع موضوعات پر خطبات، مقالات اور مضامین پیش کیے:

۱۔ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی
۲۔ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد
۳۔ اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد
۴۔ دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
۵۔ اقبال اکادمی پاکستان، لاہور
۶۔ خانۂ فرہنگ ایران، لاہور
۷۔ نیپا [NIPA]، لاہور
۸۔ پنجاب یونیورسٹی، لاہور
۹۔ قرطبہ یونیورسٹی،
۱۰۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد
۱۱۔ کراچی یونیورسٹی، کراچی
۱۲۔ پشاور یونیورسٹی، پشاور
۱۳۔ قائداعظم لائبریری، لاہور
۱۴۔ پنجاب پبلک لائبریری، لاہور
۱۵۔ الحمرا آرٹس کونسل
۱۶۔ LUMS (لاہور)
۱۷۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد
۱۸۔ پاکستان آرٹس کونسل، کراچی
۱۹۔ دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور
۲۰۔ لاہور کالج فار ویمن یونیورسٹی۔

ملکی و بین الاقوامی علمی اداروں کی رکنیت

ڈاکٹر تحسین فراقی قومی اور بین الاقوامی اداروں کے رکن کے طور پر اُردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے فعال کردار کر رہے ہیں۔

۱۔ تاحیات رکن: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور: از ۱۹۸۹ء۔

۲۔ رکن: عالمی رابطۂ ادب اسلامی، لکھنؤ۔

۳۔ رکن: عالمی رابطۂ ادب اسلامی، لاہور۔

۴۔ مستقل رکن: حلقۂ ادب، لاہور۔

۵۔ رکن: حلقۂ ارباب ذوق، لاہور۔

۶۔ رکن: مجلس ادارت، دائرۃ المعارف اقبال،
شعبۂ اقبالیات، جامعہ پنجاب، لاہور: از ۲۰۰۰ء۔

۷۔ رکن: مجلس ادارت، مجلہ قافلۂ ادب اسلامی، لاہور: از ۲۰۰۰ء۔

۸۔ رکن: مجلس ادارت، سہ ماہی اورینٹل کالج میگزین (پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج)، لاہور۔

۹۔ رکن: ہیئت تحریریہ مجلۂ پژوهش (دانشگاہ تہران) تہران، ایران۔

۱۰۔ رکن: مجلس مشاورت، سہ ماہی کاروانِ ادب، ندوۃ العلما، لکھنؤ۔

۱۱۔ رکن: مجلس مشاورت مجلہ ECI، تہران، ایران۔

۱۲۔ رکن: مجلس مصنفین برائے قومی صدارتی اقبال ایوارڈ، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔

۱۳۔ رکن: مجلس انتخاب کتب قائد اعظم لائبریری، لاہور۔

۱۴۔ سابق رکن: مجلس انتخاب کتب دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور۔

۱۵۔ سابق رکن: پاکستان اسٹڈی سنٹر، جامعہ پنجاب، لاہور۔

۱۶۔ سابق کنوینر: اُردو بورڈ آف اسٹڈیز، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور۔

۱۷۔ سابق معتمد عمومی: حلقۂ ادب، لاہور

۱۸۔ سابق رکن: مجلس حاکمہ، مجلس ترقی ادب، لاہور: ۲۲ ستمبر ۲۰۰۰ء تا ۳ فروری ۲۰۰۵ء۔

۱۹۔ رکن: مجلس مشاورت، مجلہ نوادر، لاہور: فروری ۲۰۰۱ء تا جولائی ۲۰۰۲ء۔

۲۰۔ رکن: مجلس مشاورت سہ ماہی "الزبیر" بہاول پور۔

۲۱۔ رکن: مجلہ قلم قبیلہ۔ کوئٹہ

۲۲۔ ایڈیٹر: مجلہ مخزن لاہور

۲۳۔ ایڈیٹر: ششماہی مباحث، لاہور

۲۴۔ ایڈیٹر: سہ ماہی صحیفہ لاہور

۲۵۔ رکن مجلس ادارت: "اقبالیات"، اقبال اکادمی پاکستان

۲۶۔ رکن مجلس مشاورت: مجلہ بنیاد، LUMS

۲۷۔ رکن مجلس مشاورت: مجلہ "اردو"، کراچی

۲۸۔ رکن مجلس مشاورت: مجلہ "جہات اسلام"، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

۲۹۔ رکن مجلس مشاورت: "تحقیق"، سندھ یونیورسٹی، جام شورو

۳۰۔ رکن مجلس مشاورت: مجلہ "نجات"، شعبۂ اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

۳۱۔ رکن بورڈ آف اسٹڈیز (اردو)، لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، لاہور

ادبی تخلیقات

ڈاکٹر تحسین فراقی کی ادبی تخلیقات، متنوع تصنیفات کی صورت میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ موضوعات کے لحاظ سے ان میں وسعت بھی ہے اور ان کے اوراق میں علمی بصیرت واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔ ان تصنیفات کے مندرجات پر تفصیلی گفتگو آئندہ ابواب میں پیش کی جائے گی۔ ذیل میں ان کی تصنیفی و تالیفی مطبوعات کے کوائف کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

تنقید و تحقیق

۱۔ جستجو:

ڈاکٹر تحسین فراقی کی تحقیق و تنقید کا پہلا مجموعہ "جستجو" کے عنوان سے منظرِ عام پر آیا۔ اس میں شامل مضامین: اردو ادب میں اسلامی اقدار کی پیش کش کا مسئلہ: اردو تنقید کے دس سال (۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۹ء)؛ بھٹائی اور اس کی شاعری؛ علامہ اقبال اور شاہ دے خواب؟ اقبال اور ابو العلا المعری؛ چند مماثل پہلو؛ اکبر الٰہ

آبادی؛ محمد حسن عسکری اور جدیدیت؛ بشنواز نے چوں حکایت می کند۔ اس کتاب کی اشاعت اول لاہور، مکہ بکس کے زیر اہتمام ۱۹۸۱ء میں ہوئی۔ اب تک تین ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

۲۔ مغربی جمہوریت: اہلِ مغرب کی نظر میں:

(جمہوریت سے متعلق مغربی مفکرین کے نظریات کا تنقیدی محاکمہ)

ڈاکٹر تحسین فراقی نے مغربی جمہوریت کے بعض تصورات کا محاکمہ پیش کیا ہے۔ جن مفکرین کی آراء شامل کر کے مدلل انداز میں تنقیدی نقطۂ نظر بیان کیا گیا ہے۔ ان میں سٹیفنل، لاسکی، لیکی، شمپیٹر، لارنس، رینے گینوں، اشپنگلر، بھگوتی اشن اور ایرک فروم وغیرہ کی آراء شامل ہیں۔ اس کی اشاعت اول لاہور، مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری کے زیر اہتمام ۱۹۸۳ء میں ہوئی۔

۳۔ عبدالماجد دریابادی: احوال و آثار:

(سندی مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، جامعہ پنجاب، لاہور)

مولانا عبدالماجد دریابادی کی متنوع جہتوں کا محاکمہ کیا گیا ہے۔ اس کا انتساب "والد مرحوم شیخ محمود اختر کے نام ہے۔" اشاعت اول: لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ کے زیر اہتمام اپریل ۱۹۹۳ء کو ہوئی۔ اب تک تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۴۔ معاصر اردو ادب (نثری مطالعات):

اس کتاب میں معاصر اردو نثر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب میں کل تیرہ مضامین شامل ہیں جن کے عنوانات درج ذیل ہیں: اردو ادب کے چند جدید رجحانات؛ سلیم احمد کی تنقید نگاری؛ حالی کی سفرنامہ نگاری؛ مشتاق احمد یوسفی (زمیں یاں کی چہارم آسماں ہے)؛ مقالات مظہری؛ اردو داستان؛ جنت کی تلاش؛ کانٹوں کی زبان؛ ارمغان مجنوں؛ عطائیے پر ایک اجمالی نظر؛ چاہ زنخداں اور ہے، چاہ زنخداں اور ہے؛ ملت اسلامیہ تہذیب و تقدیر؛ شعریات۔ مسلک معقولیت: ایک مختلف کتاب۔ اس کی اشاعت اول کلیہ علوم اسلامیہ و شرقیہ یونیورسٹی، لاہور کے زیر اہتمام اکتوبر ۲۰۰۰ء میں ہوئی۔

۵۔ افادات (شعری مطالعات) مرتبہ: بصیرہ عنبرین:

یہ ڈاکٹر تحسین فراقی کے شعری مطالعات پر مشتمل مجموعہ مضامین ہے جسے ڈاکٹر بصیرہ عنبرین نے مرتب کیا ہے۔ یہ مجموعہ مضامین سنگ میل پبلی کیشنز کے زیر اہتمام پہلی بار ۲۰۰۳ء میں منظر عام پر آیا۔ کتاب میں شامل مضامین کے عنوانات اس طرح ہیں: برعظیم میں مسلم تشخص کا مسئلہ اور حالی؛ برعظیم کی

فکری آزادی میں اکبر کا کردار: حفیظ۔ برعظیم میں مسلم نشاۃ ثانیہ کا نقیب: غزل کی تہذیب: ماہر القادری؛ شبیر احمد۔ اردو غزل کی توانا آواز: وحید اللہ اور عبدالعزیز خالد: شعر کا قائل کون؟: اردو مرثیہ، از آغا تا انیس: یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے: صلوا علیہ وآلہ: بیعت: چند تاثرات: دیکھو جدھر اک باغ لگا ہے اپنے رنگیں خیالوں کا: انھیں میں تیرا طواف کرتی ہیں۔

۶۔ تعبیرات تحسین فراقی (مرتبہ اشتیاق احمد):

یہ ڈاکٹر تحسین فراقی کے منتخب تنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے جسے اشتیاق احمد نے مرتب کیا ہے۔ کتاب کی اشاعت اول القمر انٹرپرائزز کے زیر اہتمام ۲۰۱۳ء میں ہوئی۔

۷۔ نکات:

یہ ڈاکٹر تحسین فراقی کے تنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے۔ سترہ مقالات اور تجزیوں پر مشتمل یہ کتاب مجلس ترقی ادب لاہور کے زیر اہتمام ۲۰۱۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کے مندرجات میں: ایران اور پاکستان کے ثقافتی مشترکات، اردو ادبیات پر نظامی گنجوی کے اثرات، فکر عالی ہو تو مضمون نیا ملتا ہے۔۔۔ امیر مینائی کی فارسی شاعری، عبرۃ الغافلین، اور سودا کے شعری تصورات، علامہ شبلی کا ایک ایرانی مداح و مترجم، عبدالستار صدیقی۔۔۔ نامور ماہر لسانیات جیّد محقق، مستشرقین کا اسلوب سیرت نگاری اور مولانا عبدالماجد دریابادی، انگریزی ترجمہ کشف المحجوب (نکلسن) پر ایک نظر، اردو زبان و ادب کے ارتقاء میں مجلس ترقی ادب کا حصہ، خطبہ صدارت، جوش ملیح آبادی۔ چند تاثرات، اردو افسانہ۔ چند تاثرات، انٹیک شاپ، چند خیالات، قرۃ العین حیدر (۱۹۲۷ء۔۲۰۰۷ء) کی یاد میں، شہر میں کھولی ہے منٹو نے دکاں سب سے الگ، مرے لیے بول، تاریخ علوم میں تہذیب اسلامی کا مقام شامل ہیں۔ ۲۰۱۸ء میں اکادمی ادبیات نے اسے تنقیدی و تحقیقی کتب میں اول انعام کا مستحق قرار دیا۔

اقبالیات

۱۔ مطالعۂ بیدل فکر برگساں کی روشنی میں:

یہ بنیادی طور پر علامہ اقبال کا ایک غیر مطبوعہ انگریزی مضمون بعنوان "Bedil in the light of Bergson" ہے، جس کا ڈاکٹر تحسین فراقی نے پہلی بار کھوج لگایا اور اردو ترجمہ کر کے ضروری حواشی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ اردو ترجمہ اصل انگریزی متن اور تعارف کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ اس میں

شامل مضامین دو حصوں پر مشتمل ہیں۔ حصہ اول: اردو تعارف از مترجم نیز اردو ترجمۂ مضمون۔ حصہ دوم: تعارف از مرتب۔ متن مضمون۔ عکس مضمون (کامل)۔ اس کتاب کی اشاعت اول لاہور، یونیورسل بکس کے زیر اہتمام ۱۹۸۸ء میں ہوئی۔ اب تک چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۲۔ نقد اقبال، حیات اقبال میں:

یہ کتاب علامہ اقبال کی شخصیت اور فکر و فن پر ان مضامین اور تبصروں کا مجموعہ ہے جو علامہ اقبال کی زندگی میں معاصر اہل فکر و نظر نے رقم کیے۔ اس کتاب کے مندرجات کی تفصیل یہ ہے:

اردو شاعری اور شعرائے حال (دیا نرائن نگم)، مباحثہ (کرش بھولا ناتھ)، ڈاکٹر اقبال (مرزا احسان احمد)، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال۔ آب حیات کے دور حاضر کا جرعہ تیز (وحید احمد مسعود بدایونی)، اقبال (صہبائی)، اردو کا پیام گو شاعر (محی الدین قادری زور)، ایک ملیحہ دستان صوبہ (ایک اعتدال پسند ہندو کے قلم سے)، اقبال کا ذوق استفہام (میر سعادت علی خان)، اقبال، یورپ اور قوم پرستی (رشید طارق)، علامہ سر اقبال (کاظم)، اقبال کی غزلیں (سکندر علی وجد)، علامہ اقبال اور ختم نبوت (سید نذیر نیازی)، لاانت کا بحر ذخیم (راجہ حسن اختر)، ضرب کلیم اور احمدیت (یوسف سلیم چشتی)، فلسفۂ شاہین (سید حسن)، اقبال کے اردو کلام کی چند خصوصیات (سید مقبول حسین احمد پوری)، اقبال اور تصوف (دیال پرشاد صبا)، اقبال (غلام سرور)، اقبال کا فلسفۂ جہاد (ظفر احمد صدیقی)، اقبال کے کلام میں عشق کا تخیل (ضیا احمد بدایونی)، تنقید علم الاقتصاد، مثنوی اقبال (شاہ سید محمد ذوقی)، اسرار خودی (نواب سلطان جہاں بیگم) اسرار خودی۔ دیوان حافظ (مشیر حسین قدوائی)، مثنوی رموز بے خودی، تبصرہ پیام مشرق (آرائے نکلسن، مترجم: محمد حبیب اللہ رشدی)، جاوید نامہ (چودھری)، بال جبریل (سکندر علی وجد)، ضمیمہ: اسرار خودی (کشاف)۔ کتاب کی اشاعت اول: لاہور، بزم اقبال کے زیر اہتمام ۱۹۹۲ء میں ہوئی۔ دوسرا ایڈیشن نظر ثانی کے بعد بزم اقبال ہی کے زیر اہتمام شائع ہونے والا ہے۔

۳۔ جہات اقبال:

یہ علامہ اقبال کی متنوع فکری جہتوں پر رقم کیے گئے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کا انتساب: "نام ور نقاد شمس الرحمن فاروقی کے نام" ہے جبکہ دیباچہ مرزا ادیب نے لکھا ہے۔ اس کتاب میں شامل مضامین: تصور الٰہ اور عبادت کا مفہوم (اقبال کے خطبۂ سوم کا اجمالی جائزہ)؛ "مسلم فلسفہ میں زمان کا مسئلہ" (علامہ اقبال کے ایک غیر مطبوعہ مضمون کا تعارف، اس کا متن اور متن کا ترجمہ)؛ جمہوریت،

اقبال کی نگاہ میں؛ معصری مسائل اور فکرِ اقبال؛ علامہ اقبال اور مسلم نشاۃِ ثانیہ؛ اقبال نامہ، مرتبہ شیخ عطاء اللہ؛ چند گزارشات، چند تصحیحات؛ جلوۂ خوں گشتہ و نگاہے بتماشا زسید؛ مطالب اقبال از مقبول انور داؤدی)؛ مسائل اقبال (از ڈاکٹر سید عبداللہ)۔ کتاب کی اشاعت اول: لاہور، بزم اقبال کے زیرِ اہتمام نومبر ۱۹۹۳ء کو ہوئی۔ اس کا نیا ایڈیشن بھی تصحیح و اضافات کے ساتھ حال ہی میں "بزم اقبال" نے شائع کیا ہے۔

۴۔ اقبال: چند نئے مباحث:

"اقبال چند نئے مباحث" میں اقبال کے فکر وفن اور اردو شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب میں شامل مضامین: اقبال کی اردو شاعری کا مختصر فنی جائزہ؛ علامہ اقبال اور پارلیمان کا حق اجتہاد؛ علامہ اقبال اور مسلم ثقافت کے خدوخال؛ مغربی تمدن کی یلغار اور فکرِ اقبال؛ کلیات مکاتیب اقبال (جلد سوم، ایک جائزہ)؛ اقبال کی چند نادر و نایاب تحریریں۔ اس کتاب کی اشاعت اول: لاہور، اقبال اکادمی پاکستان کے زیرِ اہتمام ۱۹۹۷ء میں ہوئی۔ کتاب کے تین ایڈیشن شائع ہوئے۔

۵۔ اقبال دیدۂ بینائے قوم:

مقالات کا یہ مجموعہ ۱۹۹۷ء سے ۲۰۱۳ء تک کے عرصے پر مشتمل ہے۔ کتاب بارہ تحریروں پر مشتمل ہے جن میں نیا نظام عالم اور فکرِ اقبال، اقبال کا تصورِ تہذیب، فکرِ اقبال کی عصری معنویت، اسلامی ادب کی ترویج میں اقبال کا کردار، علامہ اقبال اور اتحاد عالم اسلامی، اقبال اور جنگ، عالمیت کی صورت حال اور فکرِ اقبال اور ایران میں اقبال شناسی کے دس سال خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ یہ کتاب ۲۰۱۵ء میں پورب اکادمی، اسلام آباد کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی۔ کتاب قومی صدارتی اقبال ایوارڈ ۲۰۱۵ء کے لیے بھی منتخب ہو چکی ہے۔

غالبیات

۱۔ دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ، اصل حقائق:

یہ ایک اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ جس میں انھوں نے نسخۂ خواجہ کے حوالے سے بہت سے انکشاف انگیز حقائق بیان کیے ہیں اور تدوین و ترتیب کے ضمن میں ہونے والی غلطیوں کی نشان دہی کی ہے۔ کتاب میں اصل مخطوطے کے عکس بھی شامل ہیں۔ اشاعت اول: لاہور بک وائز کے زیرِ اہتمام اپریل ۲۰۰۰ء

میں ہوئی۔ دوسرا ایڈیشن مارچ ۲۰۰۱ء میں سورج پبلشرز لاہور کے زیرِ اہتمام متعدد اضافوں کے ساتھ شائع ہوا۔

۲۔ غالب، فکر و فرہنگ:

یہ کتاب غالب کی فارسی شاعری اور نثر نیز غالب شناسی کے حوالے سے مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس کے مندرجات کی تفصیل یہ ہے:

غالب، زیست اور تصورِ زیست؛ غالب کے فارسی مکاتیب، ایک جائزہ؛ ''مثنوی بیان نمودارئ شانِ نبوت و ولایت'' اور غالب کے چند مذہبی معتقدات؛ ''مثنوی ''چراغِ دیر'': ایک جائزہ؛ مثنوی ''ابرِ گہر بار'' اور غالب کے عمرانی فکری رویے؛ مہر نیم روز اور غالب کا شعورِ دینی؛ این مری شمل بحیثیت غالب شناس ــ چند معروضات؛ پاکستان میں غالب شناسی ــ اجمالی جائزہ اور چند تجاویز۔ اس کتاب کی اشاعتِ دوم غالب انسٹیٹیوٹ نئی دہلی نے ۲۰۱۲ء میں کی ہے۔

اس کتاب کا فارسی ترجمہ آقا حمیدی نے ''غالب، متفکرِ ہند'' کے عنوان سے کیا جو شعبۂ فارسی، جامعہ پنجاب نے ۲۰۱۰ء میں شائع کیا۔

شاعری

۱۔ نقشِ اول: (شعری مجموعہ)

یہ ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ جس میں مختلف شعری اصناف مثلاً غزل، پابند نظم، آزاد نظم، نعت، رباعی وغیرہ شامل ہیں۔ اس شعری مجموعے کی اشاعت اول مقبول اکیڈمی لاہور نے ۳۱ اکتوبر ۱۹۹۲ء میں کی۔

۲۔ شاخِ زریاب: (شعری مجموعہ)

یہ ڈاکٹر تحسین فراقی کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ جس میں مختلف اصناف شعری مثلاً غزل، پابند نظم، آزاد نظم، نعت، رباعی، فردیات کے ساتھ فارسی غزلیں اور رجائی شاعری بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کی مثنوی ''پس چہ باید کرد'' کے بعض حصوں کے آزاد اردو ترجمے بھی شامل ہیں۔ پہلی اشاعت الحمد پبلی کیشنز، لاہور کے زیرِ اہتمام ۲۰۱۲ء میں ہوئی۔ حال ہی میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔

تراجم

۱۔ حسن کوزہ گر:

جدید نامور شاعر ن۔م۔ راشد کی شخصیت کے بعض تحقیقی پہلوؤں کے سلسلے میں یہ ایک اہم تصنیف ہے جس میں ڈاکٹر تحسین فراقی کے ایک جامع مضمون کے ساتھ راشد کے بعض فارسی مصاحبے اردو ترجمے اور حواشی کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔

۲۔ نگریات:

"نگریات" ادب، تہذیب، معاشرت اور روایت سے متعلق ان منتخب متفرق مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیے۔ تراجم پر مشتمل اس مجموعے میں آٹھ مضامین شامل ہیں: ابن اسحٰق اور سیرت رسول ﷺ؛ مغربی دنیا کے چیلنج اور عالم اسلام؛ روایت کا ایک ترجمان رینے گینوں؛ تعلیم الادب اور مذہبی اقدار؛ اسلامی زاویۂ نگاہ؛ تنقید اور تاریخ؛ انتقاص کا ذہنی پن؛ کیٹس اوٹ میں؛ تحریفوں کا تصادم۔ کتاب کی اشاعت اول: کراچی اکادمی بازیافت کے زیر اہتمام ستمبر ۲۰۰۳ء کو ہوئی۔ دوسرے ایڈیشن میں جو ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا دو مضامین فارسی اور انگریزی سے ترجمہ کر کے شائع کیے گئے ہیں۔ جن کے عنوانات ہیں: داستان سلامان و ابسال؛ ایک بحر پر آشوب و پر اسرار ہے رومی: پیش گفتار۔ دوسرا ایڈیشن مجلس ترقی ادب کے زیر اہتمام شائع ہوا۔

۳۔ بے زبانوں کی زبانی: حکمت بھری کہانیاں:

یہ مشہور ایرانی ادیب مہدی آذر یزدی کے تالیف کردہ فارسی قصوں کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کا انتساب "شعبہ اردو، دانش کدۂ زبانہای خارجی (دانش گاہ تہران) کے طلبہ و طالبات کے نام کیا گیا ہے۔ "اور" کچھ باتیں" بطور دیباچہ مترجم نے لکھی ہیں۔ اس کی اشاعت اول: لاہور مارچ ۲۰۰۶ء کو ہوئی۔ اب تک چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۴۔ اچھے بچوں کے لیے اچھی کہانیاں:

یہ بھی مہدی آذر یزدی کی تالیف کردہ کہانیوں کا مجموعہ ہے جو "قصہ ہای خوب برای بچہ ہای خوب" کے زیر عنوان جدید فارسی میں "مرزبان نامہ" کی کہانیوں پر مشتمل تھا۔ اب تک اس کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

تالیفات

۱۔ کتابیات تنقید و تاریخ ادب (۱۹۷۳ء تا ۱۹۸۲ء):

یہ کتاب ۱۹۷۳ء سے ۱۹۸۲ء تک کے تنقیدی، تاریخی اور تحقیقی موضوعات پر پاکستان میں شائع ہونے والی کتب کی فہرست پر مشتمل ہے۔ اشاعت اول لاہور نیشنل بک کونسل آف پاکستان کے زیر اہتمام ۱۹۸۷ء میں ہوئی۔

۲۔ مولانا عبدالماجد دریابادی۔ کتابیات: (پمفلٹ نمبر ۱۰۶):

اس کتابچے میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے مولانا عبدالماجد دریابادی کے حوالے سے کتابیات ترتیب دی ہے۔ اس کی اشاعت اول: اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان کے زیر اہتمام ۱۹۹۱ء میں ہوئی۔

تدوین / ترتیب / انتخاب

۱۔ سلطانِ ما محمد ﷺ:

''عبدالماجد دریابادی'' کے مقالات سیرت کو اس کتاب میں ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں شامل مقالات درج ذیل ہیں: سلطانِ ما محمد ﷺ، یتیم کا راج، یتیم کی ہیبت، دو راستے، ذکرِ رسول کی بلندی، سیرت نبوی اور علمائے فرنگ، محبوب سے خطاب، فقرِ محمدی، مسابر رسول، عتابِ محبوب، میلادی روایات، ناک کا داغ، اسوۂ حسنہ، ولادت باسعادت، رحمۃ للعالمین، یتیموں کا والی، غلاموں کا مولا، ہم امیوں کا ایک بشر۔ اشاعت اول: لاہور، مک بکس کے زیر اہتمام ہوئی۔ بعد ازاں اضافوں کے ساتھ اس کے تین ایڈیشن بالترتیب مقبول اکیڈمی، دارالتذکیر اور سنگِ میل کے زیر اہتمام شائع ہوئے۔

۲۔ عجائباتِ فرنگ:

یہ یوسف خاں کمبل پوش کے سفرنامے تاریخ یوسفی المعروف بہ ''عجائبات فرنگ'' کی تدوین ہے۔ اشاعت اول: لاہور، مک بکس کے زیر اہتمام ۱۹۸۳ء میں ہوئی۔ دوسرا ایڈیشن زیر طبع ہے۔

۳۔ شوقِ آخرت:

''مولانا اشرف علی تھانوی کی اس کتاب کا مولانا عبدالماجد دریابادی نے بہت پہلے ترجمہ اور توضیح کی تھی اور اس کا نام شوقِ آخرت رکھا تھا۔ مولانا دریابادی کا یہ ترجمہ و توضیح ان کی وفات تک بوجوہ

شائع نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس کی تصحیح و تہذیب کر کے اس پر سیر حاصل مقدمہ لکھا اور ترتیب دیا ہے۔ اس کی اشاعت اوّل: لاہور، ادارۂ اسلامیات کے زیرِ اہتمام محرم الحرام ۱۴۲۱ھ مئی ۲۰۰۰ء میں ہوئی۔ یہ کتاب چند برس پہلے ہندوستان سے بھی شائع ہو چکی ہے۔

دیوانِ فارسی امیر مینائی:

امیر مینائی کا یہ فارسی دیوان فارسی دیوان ہے جس میں اُن کی غزلوں کے علاوہ رباعیات، قصائد، مناقب، قطعات اور مثنویات شامل ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس قلمی نسخے کی تدوین کی، اس پر جامع مقدمہ لکھا ہے اور حواشی درج کیے ہیں۔ یہ دیوان شعبۂ فارسی، پنجاب یونیورسٹی لاہور نے ۲۰۱۵ء میں شائع کیا۔

انتخاب کلام میر اثر:

خواجہ محمد میر اثر کی شاعری کا یہ انتخاب آکسفرڈ کے سلسلۂ انتخاب بعنوان اُردو ورثہ کے تحت ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس انتخاب کا مختصر دیباچہ رقم کیا ہے اور کلام پر بعض ضروری حواشی لکھے ہیں۔

چلا آرہا ہوں سمندروں کے وصال سے:

ن۔م۔ راشد کی نظموں کا انتخاب ہے جس میں ۳۲ نظمیں شامل ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے مختصر اور جامع مقدمہ رقم کیا ہے۔ انتساب ڈاکٹر شمیم حنفی کے نام کیا گیا ہے۔ یہ انتخاب سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور سے ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا ہے۔

قواعدِ فارسی (موسوم بہ صرفِ صغیر):

یہ ڈپٹی نذیر احمد کی تصنیف ہے جو فارسی سیکھنے والے طلبہ کے لیے بہت مفید ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس کا مختصر مقدمہ لکھا ہے اور اس کے متن کی تصحیح اور حواشی رقم کیے ہیں۔ مجلس ترقی ادب، لاہور کے زیرِ اہتمام ۲۰۱۹ء میں شائع ہوئی۔

مرتبات بہ حیثیت شریک مرتب

ا۔ کربلا سے کابل تک (جہادِ افغانستان پر منتخب نظمیں):

اس کتاب میں افغان جنگ کے ردِ عمل میں پاکستانی رزمیہ شاعری کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔

شریک مرتب نائلہ کرنالی ہیں۔ پاک افغان اسلامی محاذ، لاہور کے زیر اہتمام دسمبر ۱۹۸۱ء کو ہوئی۔

۲۔ ارمغانِ علمی بہ پاسِ خدماتِ علمی و ادبی ڈاکٹر وحید قریشی:

اس کتاب میں ڈاکٹر وحید قریشی کا تعارف اور ان کی دلچسپی کے علمی میدانوں میں محققین اور ناقدین کے تحقیقی و تنقیدی مقالات و مضامین شامل ہیں۔ شریک مرتبین ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور ڈاکٹر عارف نوشاہی ہیں۔ اسے مجلس ادبیات مشرق لاہور نے اقرا انٹرپرائزز لاہور کے اشتراک سے ۱۹۹۸ء میں شائع کیا۔

۳۔ یادنامہ داؤدی: (خلیل الرحمٰن داؤدی کی شخصیت و فن پر اور خود داؤدی صاحب کے منتخب مضامین)

اس کتاب میں خلیل الرحمٰن داؤدی کی شخصیت اور ان کی تحقیقی خدمات پر منتخب کردہ مضامین شامل ہیں۔ شریک مرتب جعفر بلوچ ہیں۔ سنہ اشاعت جنوری ۲۰۰۳ء اور ناشر دارالتذکیر لاہور ہے۔

۴۔ ارمغانِ ڈاکٹر سید عبداللہ:

اس کتاب میں ڈاکٹر سید عبداللہ سے متعلق مضامین کے علاوہ اہل علم کے اردو اور انگریزی تحقیقی و تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ شریک مرتب ڈاکٹر ضیاء الحسن ہیں۔ سنہ اشاعت اکتوبر ۲۰۰۵ء اور ناشر شعبہ اردو اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور ہے۔

میر تقی میر (منتخب مضامین):

یہ کتاب میر تقی میر کے فکر و فن پر رقم کیے گئے مضامین کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ جس کے شریک مرتب ڈاکٹر عزیز ابن الحسن ہیں۔ یہ منتخب مضامین ۲۰۱۰ء میں مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد نے شائع کیے اور بعد ازاں کتاب سرائے لاہور سے ۲۰۱۱ء میں نظر ثانی اور اضافہ شدہ اشاعت منظر عام پر آئی۔

نصابیات

۱۔ بہار اردو برائے جماعت دہم:

پنجاب ٹیکسٹ بورڈ کے لیے اس کتاب کو جماعت دہم کے طالب علموں کی ضروریات کے پیش نظر ترتیب دیا گیا ہے۔ شریک مصنفین میں جعفر بلوچ اور ڈاکٹر محمد سلیم ملک شامل ہیں۔ اس کی پہلی اشاعت مارچ ۲۰۰۲ء میں ہوئی۔ اب تک متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

زیرِ طبع

۱۔ اقبال نامہ (جلد اول، دوم) مرتب: شیخ عطا اللہ۔
(تصحیح متن، ترتیب نو، حواشی، مقدمہ)

۲۔ میراث ہنرِ اسلامی در پاکستان، ڈاکٹر احمد نبی خان کی انگریزی تالیف:
"MUSLIM ART HERITAGE OF PAKISTAN"
کا فارسی ترجمہ: شریک مترجم: لیلیٰ عبادی تجمت۔

زیرِ ترتیب

۱۔ دیوانِ بلیغ (اردو) از قدرت اللہ بلیغ (مبنی بر منحصر بفرد نسخہ) (ترتیب، مقدمہ، حواشی)

۲۔ عبرۃ الغافلین: سودا کے فارسی تنقیدی رسالے کا متن مع اردو ترجمہ (ترتیب، مقدمہ، حواشی)

۳۔ تاریخِ یوسفی: یوسف کمبل پوش کے غیر مطبوعہ سفرنامے کا فارسی متن (ترتیب، حواشی)

۴۔ الیساندرو بوزانی کے فارسی شعر و ادب پر انگریزی مقالات کا انتخاب مع حواشی و تعلیقات On
Persian Poets & Poetry

آئندہ کے منصوبے

ڈاکٹر تحسین فراقی عہدِ حاضر کی ان چند شخصیات میں سے ہیں جن کی علمی ادبی سرگرمیوں اور اشغال نے ایک معتبر تنوع کی صورت میں ظہور کیا۔ ان کی بہت سی تحقیقات منصۂ شہود میں آئیں اور کچھ آئندہ ظہور کی منتظر ہیں۔ ذیل میں ان کے آئندہ منصوبوں کا مختصراً حوال پیش ہے۔

۱۔ سبل بیدل: انتخاب شعر بیدل (فارسی) (ترتیب)

۲۔ بستانِ حکمت ("انوارِ سہیلی" کا اردو ترجمہ) تالیف: فقیر محمد خان گویا [ترتیب، تصحیح متن، مقدمہ]

۳۔ عقدِ گوہر (مثنوی مولوی کی منتخب حکایات کا منظوم ترجمہ) تالیف: پیرزادہ محمد حسین (ترتیب، مقدمہ)

۴۔ قدرت اللہ بلیغ اور ان کا فارسی کلام (مبنی بر شش دواوین فارسی، منحصر بفرد)
(بلیغ کے منحصر بفرد چھے فارسی دواوین پر مبنی تفصیلی کتاب)

۵۔ رو برو (ڈاکٹر تحسین فراقی سے کیے گئے مصاحبے، مکالمے)

مجلّہ

ا۔ مباحث:

ڈاکٹر تحسین فراقی اپنی دلچسپی اور کاوش سے مجلّہ مباحث نکال رہے ہیں۔ اب تک اس کے دو شمارے منظرِ عام پر آ چکے ہیں اور اپنے نادر مشمولات کے باعث اُردو دنیا میں گفتگو کا موضوع بنے ہیں۔

شخصیت

سماجی اعتبار سے ڈاکٹر تحسین فراقی کا شمار متوسط طبقے کے اُن افراد میں ہوتا ہے جو اپنی محنت شعاری کی بنیاد پر اپنا راستہ خود تلاشتے اور تراشتے ہیں۔

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں

اُن کی تمام تر کامیابیوں کا سبب کام اور مسلسل کام ہے۔ فکری و نظری طور پر بھی وہ ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں اور عملی زندگی میں بھی اُن کا یہی شعار ہے۔ مسلسل کام کرنے والے افراد اور فکری لحاظ سے زندگی میں کاملیت کی تلاش کرنے والوں کے مزاج میں قدرے تلخی بھی در آتی ہے اور معاملات میں نارواداری برتنا اُن کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کے ہاں بھی اصول پسندی اور معاملات میں ناپ تول کی برابری کا عنصر واضح ہے لیکن وہ مزاجاً تلخ ہونے کے بجائے شیریں طبع ہیں۔ اُن کی گفتگو میں جہاں عالمانہ معیار نظر آتا ہے وہاں شگفتگی کا عنصر بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

ع نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو

ڈاکٹر تحسین فراقی مضبوط اعصاب کے مالک ہیں۔ بعض سانحات انسان کو ذہنی و جسمانی طور پر عجب شکست و ریخت سے دوچار کرتے ہیں۔ خصوصاً جب کوئی سانحہ تب رونما ہو جب خورشیدِ حیات اُفق کی مغربی جہت میں ہو۔ فراقی صاحب نے اس سلسلے میں بہت حوصلہ مندی کا ثبوت دیا ہے اور اپنی زندگی کے بعض سانحات کا سامنا کرتے ہوئے اپنے اعصاب کو مستحکم رکھنے کی سعی کی ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی مذہبی لحاظ سے راسخ ا[illegible] ہیں۔ دینی اقدار اُن کے ظاہر و باطن میں جذب ہیں۔ وہ جن فکری حلقوں سے تعلق رکھتے ہیں اُن میں بھی دینی اقدار کے فروغ کی کاوشیں نمایاں ہیں اور

وہ اس سلسلے میں اپنے نقطۂ نظر پر نہایت استحکام کے ساتھ قائم رہنے والے ہیں۔ اُن کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کے تسلسل اور ارتقا کی بنیاد بھی اُن کے دینی نظریات ہیں اور اپنی تنقید میں وہ اسی عمرانی زاویۂ نظر کے معتقد و پیروکار ہیں۔

تدریس ڈاکٹر تحسین فراقی کا پیشہ بھی ہے اور عشق بھی۔ وہ جامعہ پنجاب کے شعبۂ اُردو کے مایۂ ناز اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ اُردو کے ساتھ ساتھ اُن کی لسانی دسترس عربی اور فارسی کے علاوہ انگریزی میں بھی کمال درجے کی ہے۔ کلاسیکی شاعری، اقبالیات اور جدید فکری مباحث ایسے مضامین کی تدریس انھیں بہت مرغوب رہی ہے۔

طالب علم اُن سے حصولِ علم اور سیکھنے کے عمل کے ساتھ ساتھ ذہنی اور روحانی طور پر متاثر بھی ہوتے ہیں۔ اگرچہ موخر الذکر استفادے کا انحصار توفیق پر ہے اور یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اُن سے صرف ایسے ہی طالب علم متاثر ہوتے ہیں جن کے باطن میں جذب و توفیق کا کوئی عنصر بھی ہوتا ہے ورنہ معاشرے کے روایتی سانچے میں ڈھلے بعض طالب علم اُن سے گریزاں بھی نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کا حلقۂ احباب بہت وسیع نہیں ہے۔ اس کی ایک وجہ اُن کی مقصد اساس مصروف زندگی بھی ہے اور اُن کے فکری و نظری معاملات بھی۔ اُن کے زیادہ تر احباب شعبۂ تدریس سے وابستہ ہیں یا جن سے وہ نظریاتی ہم آہنگی محسوس کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں سراج منیر، ڈاکٹر خورشید رضوی، افتخار عارف، ڈاکٹر شمیم حنفی، شمس الرحمٰن فاروقی اور جعفر بلوچ بطور خاص لائقِ ذکر ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی سیر و سیاحت کے دلدادہ ہیں اور انھیں قدرت نے اس کے مواقع بھی فراہم کیے ہیں۔ پاکستان سے باہر وہ کئی ممالک کی سیر کر چکے ہیں۔ ترکی اور ایران اُن کے پسندیدہ ممالک ہیں جس کی بنیادی وجہ وہ تہذیب و ثقافت ہے جس سے وہ ذہنی قربت محسوس کرتے ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کی شخصیت کی تشکیل میں اُن کے گھر کے علمی و ادبی ماحول کا بڑا کردار ہے۔ جس سے انھوں نے گہرا اثر قبول کیا۔ اُن کی تمام تر مصروفیات کا مرکز و محور علم کی تحصیل اور علم ہی کی ترسیل ہے۔ آپ نے علم کے معاملات کو محض ذہن تک محدود نہیں رکھا بلکہ قلب و روح کا حصہ بنایا ہے۔ ان کے اسلوبِ گفتگو، طرزِ عمل اور طور و فکر کے علاوہ انداز نگاہ سے بھی اُن کی علمی و تہذیبی شخصیت کا عکس نمایاں ہوتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، (انٹرویو) خالد ہمایوں/احمد عطا، قومی ڈائجسٹ، فروری ۲۰۰۹ء، ص ۱۴

۲۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، (انٹرویو) ""آتش زیر پا" از آغا شیدا کاشمیری ۱۹۹۳ء، ص ۱۵۵

۳۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، (انٹرویو) "ادبی ستارے" از ڈاکٹر عارفہ صبح خان، مکتبہ اردو، لاہور ۲۰۱۳ء، ص ۱۷۰

۴۔ قومی ڈائجسٹ، ص ۱۴

۵۔ ایضاً، ص ۱۶

۶۔ ادبی ستارے، ایضاً، ص ۱۷۱

۷۔ قومی ڈائجسٹ، ص ۱۶

۸۔ ایضاً، ص ۱۷

۹۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، (انٹرویو) ضیائے حدیث، شمارہ ۴، اپریل ۲۰۱۳ء، ص ۳۰

باب دوم

ڈاکٹر تحسین فراقی کی تحقیق و تنقید

ڈاکٹر تحسین فراقی کے تخلیقی و تہذیبی سفر کا ایک اہم پڑاؤ اُن کی تحقیق و تنقید ہے۔ اُن کی تحقیق اور تنقید کی داخلی جڑت ایسی ہے کہ انھیں ایک دوسرے سے الگ کرنا قدرے مشکل ہے۔ اُن کی تنقید تحقیق اساس ہے اور تحقیق کسی اہم تنقیدی نقطے پر منتج ہوتی ہے۔

اقبال، غالب، ن م راشد، عبدالماجد دریابادی اور دیگر موضوعات پر اُن کی تحریروں کے باطن میں تلاش و جستجو بھی نظر آتی ہے اور گہرے تنقیدی نقوش بھی۔ انھوں نے متنوع موضوعات پر قلم اُٹھایا اور کسی بھی موضوع کے احاطے کے لیے اپنی تحقیقی استعداد اور تنقیدی بصیرت کو برابر کام میں لائے۔ یوں اُن کی ادبی کاوشیں ایک ایسے متجسس ذہن کی پیداوار قرار پاتی ہیں جس میں فکر و نظر کی گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔

اس سے قبل کہ ڈاکٹر تحسین فراقی کی تحقیقی و تنقیدی خدمات کا مفصل اور موضوع وار جائزہ لیا جائے۔ تحقیق اور تنقید کے بارے میں اور بالخصوص اردو تحقیق و تنقید سے متعلق اُن کے تصورات پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ وہ کہتے ہیں:

> "تنقید تحقیق کے لیے مرغِ سمت نما کا کام کرتی ہے۔ تنقید تہذیب ہے۔ یہ محاکمہ ہے نظمِ حیات کا اور کارگہِ فکر و فرہنگ کا۔"(۱)

> "تحقیق ایک کل وقتی سرگرمی ہے۔ سماجی و ادبی علوم ہی کیا، سائنسی علوم کے لیے بھی کسی بڑے کردار کی ضمانت اُس وقت تک نہیں دی جا سکتی، جب تک اُن شعبوں سے وابستہ لوگ شبانہ روز محنت اور ریاضت نہیں کرتے۔ بڑے ادبی، علمی، عمرانی اور سائنسی شاہکار، متجسس روحوں اور انتھک محنتوں کی صبح و مسا کی ریاضتوں کا ثمر ہیں۔"(۲)

"میں سنی سنائی اور پڑھی پڑھائی باتوں کے بجائے خود شعری و نثری متون میں ڈوب کر اخذ نتائج کرتا ہوں اور انھیں اعتماد کے ساتھ پیش کر دیتا ہوں۔ تحقیق میں بھی میرا طریق کار ایسا ہی رہا ہے۔ زہر ہلاہل کو قند نہ کہنے کے اسی میلان کا نتیجہ ہے کہ اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش۔"(۳)

"ہماری اُردو تنقید ایک عرصے سے بے سمتی اور لامرکزیت کا شکار نظر آتی ہے تو اس کا بنیادی سبب بھی یہی ہے کہ دیگر علوم کی طرح تنقید نے اپنا مدار بھی صرف سمع اور بصر کی محدود معنویت پر رکھا ہے اور وہ "قلب" کی وسعت، بے کرانی اور اعماق سے محروم ہو گئی ہے۔ حالانکہ سمع، بصر اور فواد (قلب) کی تثلیث ہی وہ توحیدِ فکر پیدا کرتی ہے جس سے اس وقت ہماری تنقید تہی دامن نظر آتی ہے۔"(۴)

ڈاکٹر تحسین فراقی کے مذکورہ ارشادات سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ تحقیق و تنقید کو نہ تو کوئی جزوقتی مشغلہ سمجھتے ہیں نہ ہی تصانیف میں اضافے کا وسیلہ خیال کرتے ہیں بلکہ اُن کے نزدیک یہ ایک مقصدِ حیات ہے ایک ایسا تہذیبی عمل ہے جس سے زندگی کے ادھورے پن سے گریز اور کاملیت کی جانب سفر طے کیا جاتا ہے۔

وہ جہاں تنقید کو تہذیبی فرد کا تنظیمی عمل خیال کرتے ہیں، وہاں اُن کے ہاں اُردو تنقید اور خصوصاً معاصر منظرنامے کے سلسلے میں عدمِ اطمینان اور اضطراب کا عنصر نمایاں ہے۔ اس بے اطمینانی کی ایک بڑی وجہ وہ فکری سمت بھی ہو سکتی ہے جس کی جانب وہ گامزن تو ہیں لیکن وہ دیگر اہلِ کارواں کو برعکس چلتا ہوا دیکھتے ہیں اور اُن کے نزدیک یہ سفرِ معکوس بے سمتی کے سوا اور کچھ نہیں لیکن اُن کی دل گرفتگی کا ایک بڑا سبب "ہم رہانِ سست عناصر" ہیں جو تحقیق و تنقید کی اِن پُرخار رہ پر چلنے کے سلیقے ہی سے آشنا نہیں یا پھر وہ "مسافرانِ تیز گام" جو کاتا اور لے دوڑی پر یقین رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کے ہاں تحقیق و تنقید کا فریضہ ایک خاص قرینے، سلیقے اور توازن کے ساتھ تکمیل پذیر ہوتا نظر آتا ہے۔

اُن کے موضوعاتِ نقد میں وسعت ہے لیکن وہ کسی بھی موضوع کے احاطے میں عجلت پسند واقع نہیں ہوئے۔ اُن کے خیالات و نظریات سے اختلاف کے کئی ایک پہلو نکل سکتے ہیں لیکن وہ اپنی علمی دلالت اور اسلوب کی سنجیدگی پر حرف نہیں آنے دیتے اور یہی وہ عنصر ہے جو انھیں اُردو کے اُن محققین و ناقدین کی صف کا حصہ بناتا ہے کہ اخلاص اور وابستگی جن کا جزوِ ایمان ہے۔

(۱)

ڈاکٹر تحسین فراقی کی تحقیق و تنقید کا ایک وسیع حصہ اقبال کے افکار کی تفہیم و تعبیر سے متعلق ہے۔ ان کی تنقید کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ان کی جملہ تحریروں کا مرکز و محور فکرِ اقبال کی ترویج ہے۔ وہ اپنی تنقید کی جن تہذیبی و تاریخی مسائل سے جرأت ظاہر کرتے ہیں، ان کی نسبت اقبال کی فکری جہات ہی سے ہے۔ وہ کسی عرصۂ نقد پارہ، مقالاتِ فکر و نظر کا اجتماعی جائزہ لیں یا کسی لکھنے والے کے سرمایۂ تحقیق کا انفرادی تجزیہ پیش کریں، ان کے سامنے وہ مسائل و معاملات بہرحال رہتے ہیں جو طبعِ اقبال کو طوفان آشنا رکھتے تھے۔

اقبال سے متعلق ڈاکٹر تحسین فراقی کا اب تک سرمایۂ نقد "جستجو" میں شامل ان کے دو مضامین "علامہ اقبال اور شائے خواجہ" اور "اقبال اور ابوالعلا معری — چند مماثل پہلو" کے علاوہ چار مستقل کتب "جہاتِ اقبال"، "اقبال چند نئے مباحث"، "اقبال۔ دیدۂ بینائے قوم" اور "نقدِ اقبال۔ حیاتِ اقبال میں" شامل ہیں۔ یہاں "مطالعۂ بیدل فکرِ برگساں کی روشنی میں" کا ذکر بھی مناسب ہوگا جو اقبال کا ایک بہت فکر انگیز مضمون ہے اور اسے ڈاکٹر تحسین فراقی نے دریافت کر کے جامع ترجمے اور وقیع حواشی کے ساتھ مدون کیا ہے۔

مذکورہ بالا تصانیف کی روشنی میں ڈاکٹر تحسین فراقی کی اقبال شناسی کی نمایاں جہتوں کا تعین کیا جائے تو ان میں کلامِ اقبال سے متعلق فکری و نظری مباحث، عالمی و مقامی سطح پر اقبال شناسی کے ارتقا کا جائزہ، اقبال اور عصری عالمی تہذیبی صورتِ حال، فکرِ اقبال کا عالمی اہلِ دانش کے افکار سے مماثلات اور اختلافات کا تعین و تجزیہ، اقبال سے متعلق تحقیقی و تنقیدی کتب کے جامع جائزہ کے ساتھ ساتھ اقبال کی نایاب و نادر تحریروں کی بازیافت شامل ہیں۔

اقبالیات کے سلسلے میں ڈاکٹر تحسین فراقی کے حرف ہائے نقد و تحقیق کے جائزے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے بارے میں ان کے چند ارشادات نقل کر دیے جائیں تاکہ اندازہ ہو کہ وہ انھیں فکری و تہذیبی حوالے سے کس منصب پر متمکن دیکھتے ہیں:

> "غالب کی طرح شاعری کا دوسرا امامِ اعظم ہمیں علامہ اقبال کی شکل میں نظر آتا ہے۔"(۵)

> "میرا ایقان ہے کہ اقبال ہماری ڈیڑھ ہزار سالہ عربی و عجمی شعری، تخلیقی اور

فکری روایت ہی کا امین نہیں، مغرب کے کلاسیکی و جدید طلائی افکار کا بھی خزانہ دار ہے۔"(۶)

"جہاں تک اقبال کا تعلق ہے یہ بات واضح ہے کہ انھوں نے علومِ شرق و غرب اور ادبیاتِ عالم کا جس قدر گہرا مطالعہ کیا تھا، اتنا شاید ہی آج کے کسی تخلیق فن کار کے حصے میں آیا ہو۔"(۷)

"علامہ اقبال ہمارے ایسے نابغۂ عصر تھے جو خدا، انسان اور کائنات، تینوں کا ایک مخصوص اور متوازن شعور رکھتے تھے۔ اُن کے نزدیک زندگی ایک بامعنی سرگرمی ہے جو جہانِ تازہ و امتحانِ تازہ سے عبارت ہے۔"(۸)

"علامہ اقبال ہمارے واحد شاعر ہیں جو شاعری کے امامِ اعظم ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفہ و فکر میں بھی یکتا ہیں۔ اُن کے یہاں شعر اور فکر گھل مل کر چیزے دگر بن گئے ہیں۔ اُردو اور فارسی کے محض چند شاعر ہی موضوعات کے تنوع اور فکریات کی گہرائی کے باب میں علامہ کے حریف ہیں۔"(۹)

"اقبال ایک کثیر الجہات شخصیت تھے۔ انھوں نے مشرق و مغرب کی شعری، فکری اور فلسفیانہ روایات سے بھرپور استفادہ کیا۔ شاعری کے علاوہ انھوں نے نثر کو بھی اپنے افکار کی جولاں گاہ بنایا۔"(۱۰)

"اقبال کی مثال اس اعتبار سے اور زیادہ لائقِ توجہ ٹھہرتی ہے کہ وہ بیک وقت شاعر بھی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ گہرا فلسفیانہ مزاج بھی رکھتے ہیں۔ اُردو ہی کیا کسی بھی زبان میں اس طرح کی مثالیں خال خال ہیں۔"(۱۱)

"حق یہ ہے کہ شاعری کا یہ شاہ دریا آتیں آج بھی اپنا فیض عام کیے ہوئے ہے۔"(۱۲)

اقبال پر ڈاکٹر تحسین فراقی کی تصانیف سے مذکورہ ارشادات اپنے ممدوح سے قلبی لگاؤ کو بھی واضح کرتے ہیں اور وہ اسباب بھی منور ہوتے ہیں جو اس لگاؤ کی بنیاد ہیں۔ وہ انھیں اُردو شاعری کا امامِ اعظم خیال کرتے ہیں مگر اُن کے کلام کو محض فنِ شعر کی بنیاد پر نہیں دیکھتے بلکہ فکر و فلسفہ کے اس پورے تناظر کو بھی نگاہ میں رکھتے ہیں جس کے باعث کلامِ اقبال میں ایسا فکری ترفع اور موضوعات کے تنوع کا

جمال پیدا ہوا ہے جو عالمی سطح پر نہایت قلیل اہل فن کو نصیب ہوا ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی، اقبال کے مداح ہیں اور اپنے ممدوح سے متعلق مطالعہ و مباحث کی روایت پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ اس روایت میں موجود اُن جہتوں کے معترف ہیں کہ جن کا احاطہ ہمارے معتبر اقبال شناسوں نے کر رکھا ہے لیکن مجموعی طور پر ڈاکٹر تحسین فراقی اس روایت سے کچھ زیادہ مطمئن نظر نہیں آتے بلکہ بعض حوالوں سے نہایت شاکی دکھائی دیتے ہیں۔

"اُردو تنقید کے دس سال (۱۹۷۰ء-۱۹۷۹ء)" میں انھوں نے اُردو تنقید کو جہاں دیگر رجحانات کے پس منظر میں دیکھا ہے، وہاں اقبال شناسی کی روایت کا بھی جائزہ لیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

> "اقبال کے نقادوں کا یہ المیہ رہا ہے کہ انھوں نے اقبال کو مصرعِ طرح سمجھ رکھا ہے اور اس پر طرح طرح سے طبع آزمائی کرتے رہے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے لیکن اقبال کو بالکل اُسی طرح دیکھنا اور جانچنا جس طرح وہ اصلاً تھا، بڑا مشکل اور جاں کاہ کام ہے۔" [illegible]
>
> "اقبال کو اب تک جو نقاد ملے ہیں، اُن میں کم از کم نوے فیصد ایسے ہیں جن کے یہاں وہ جامعیت مفقود تھی جو تخلیق کے جوہر تخلی کو آئینہ کر دیتی ہے۔۔۔ اب تک اقبال کے سلسلے میں جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، بیشتر کام اُفقی جہات میں ہوا ہے۔ اس میں پھیلاؤ تو دریا صحرا کی خبر لاتا ہے لیکن عمق نہیں۔ وسعت ہے، گہرائی نہیں۔ سطح ہے، قعرِ دریا نہیں جس میں آگ ہوتی ہے اور نہنگوں کے نشیمن بھی ہوتے ہیں، ہاں، چھوٹے مطالب اور اجلے معانی کی ایک فصل اُگ آئی ہے اور اقبالی نقاد اس کثرت سے پیدا ہو گئے ہیں جیسے، معاف کیجیے گا، برسات میں کینچوؤں اور گھمبیوں کی پالیاں اور فصلیں یکا یک ظہور کرتی ہیں اور برسات گزرتے ہی ناپید اور نابود ہو جاتی ہیں۔ ان نقادوں میں ایسے لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں، جن کے لیے اقبال ایک نفع رساں کاروبار Paying Profession بن گیا ہے۔" [illegible]

اقبال شناسوں کے بارے میں یہ آرا بعض اہلِ نقد کے لیے محلِ نظر ہو سکتی ہیں اور کسی حد تک ان میں مبالغے کا شائبہ بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ بیانات ڈاکٹر تحسین فراقی کے اضطراب اور عدم اطمینان کو بجا طور

پر ظاہر کرتے ہیں اور اسی کی بنیاد پر وہ اقبال کو ایک بار یک بیں نقاد کی طرح دیکھتے ہوئے فکرِ اقبال کی اصل تک رسائی حاصل کرنے کے بے تابانہ عمل سے گزرتے ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کی اقبال شناسی کی اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بھی ذہن نشین رہے کہ وہ اقبالیات کے میدان میں قلم آزمانے والے ناقدین کو چار مدوں میں تقسیم کرتے ہیں:

i۔ وہ نقاد جو ادبیاتِ مغرب کے عالم تھے مگر مشرقی ادب سے مناسب حد تک مس نہیں رکھتے تھے۔

ii۔ وہ نقاد جو مشرقی ادب سے تو آشنا تھے لیکن مغربی ادب کے ذائقے سے آشنا نہ تھے۔

iii۔ ایسے نقاد جو اقبال کی مرکزی فکر یا جدید اصطلاح میں منشائے مصنف سے آگاہ ہی نہ تھے اور انھوں نے کلامِ اقبال کی من چاہی تعبیر کی۔

iv۔ مستشرقین جنھوں نے کلامِ اقبال کا ترجمہ کیا یا اُس کی بعض جہتوں پر تنقیدی تحریریں رقم کیں۔

اقبالیات کے سلسلے میں نقد و نظر کے معاملات کو دیکھا جائے تو مذکورہ چار اقسام کے علاوہ بھی بعض نوعیت کے ناقدین صف بہ صف نظر آسکتے ہیں لیکن نمایاں نوعیتیں وہی ہیں جو ڈاکٹر تحسین فراقی نے بیان کی ہیں۔ اُن میں یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ بعض اہم تقاضوں کے فقدان یا کسی ایک سمت میں شدید جھکاؤ کے باعث تنقیدی عمل اُس کاملیت کی جانب راغب نہیں ہو سکا، جس کی تمنا ڈاکٹر تحسین فراقی کر رہے ہیں۔

اقبال کے فکر و فرہنگ پر ڈاکٹر تحسین فراقی کی ابتدا اقبال کی نعت سے متعلق جامع بحث سے ہوتی ہے۔ "اقبال اور ثنائے خواجہ" کے عنوان سے یہ مضمون ایک ایسے شعری پہلو سے تعلق رکھتا ہے جو اقبال کے ہاں کسی خارجی پیکر کی صورت میں کوئی وجود نہیں رکھتا۔ یعنی اقبال کے پورے کلام میں نعت بہ طور صنفِ شعر کہیں نظر نہیں آتی۔ گویا اقبال نے نعت کو جسم کے بجائے بہ طور روح قبول کیا اور یہ اُن کے پورے کلام میں اپنی مکمل جذب و مستی کے ساتھ موجود ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنے مضمون میں اُردو شاعری میں نعت کے ارتقا کا کوئی تفصیلی تجزیہ تو پیش نہیں کیا لیکن اُس پر اُن کی بصیرت افروز نگاہ ہے۔ اُن کا یہ نقطۂ نظر نعت کی روایت، مزاج اور ماحول کے حوالے سے بہت اہم نیز توجہ طلب ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اُردو کے وہ نعت گو شعرا بھی جن کا اُردو کے نعتیہ ادب میں مقام بنتا ہے الا ماشاء اللہ نعت کے اس انقلابی تصور سے دور رہے ہیں جو اپنی نہایت متنوع اور جمیل ترین صورت میں اقبال کے یہاں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ وہ شاد عظیم آبادی

ہوں یا امیر مینائی، محسن کاکوروی ہوں یا بیدم وارثی ان کے یہاں عقیدت کا اظہار تو خوب خوب جھلکتا ہے لیکن محبت کے گوہر شب تاب بہت کم نظر آئیں گے۔ تخیل جبرائیل، تصور سرافیل اور شیریں دیوانگی کا جو امتزاج نعت اقبال میں دکھائی دیتا ہے قریب قریب ہر شاعر کے یہاں معدوم ہے۔ مثلاً جن چار شعرا کا ابھی ذکر ہوا ان کی بیشتر نعت گوئی حضور کی سراپا نگاری اور ان کے جسمانی محامد و محاسن پر صرف ہوئی ہے۔"(۲۰)

جسمانی محامد اور سراپا نگاری نعت کا ایک جزو قرار ہیں لیکن انھیں کلی طور پر مقصود نعت بنا لینے سے نعت شخصی قصیدے سے اوپر نہیں اٹھتی۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نعت اسی تحرک اور انقلاب کی جمالیات سے معمور صنف شعر کے اندر انفعالی رویوں کے فروغ پر اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہیں اور اس تناظر میں انھیں اقبال کی نعت انقلابی اوصاف کی حامل نظر آتی ہے۔ وہ اقبال کی تخلیق کردہ نعت کو بعض افکار حالی کے تسلسل میں دیکھتے ہوئے جدید نعت گوئی کے معیارات پر پرکھتے ہیں۔ اُن کا یہ نتیجہ بہت حد تک درست ہے کہ:

"حق یہ ہے کہ اقبال کا سا توازن فکر و نظر ہر کسی کو کم ہی ارزانی ہوتا ہے۔ اسی توازن فکر و فرہنگ نے ان کی نعت کو یک رُخا ہونے سے بچایا ہے اور ان کی نعت عشق رسول ﷺ کا معیار قرار پاتی ہے۔ ایسی نعت جس کی نظیر عربی، فارسی اور اُردو میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ اقبال کے معاصرین میں ظفر علی خاں ایک استثنا کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی بعض نعتیں جدید نعت گوئی کے معیار پر پوری اُترتی ہیں۔"(۲۱)

ڈاکٹر تحسین فراقی نے اقبال کی نعت میں خیالات کے عناصر تلاش کرتے ہوئے اُسے عالمی مدوجزر اسلام کے تناظر میں بالعموم اور برصغیر میں برطانوی نوآبادیاتی نظام کی تشکیل اور مسلمانوں کے زوال کے پس منظر میں بالخصوص دیکھا ہے۔

اقبال کے افکار کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو ان کا وہ ردعمل واضح نظر آتا ہے جو برطانوی نوآبادیاتی نظام اور فرنگی تسلط کے باعث بیشتر مسلمان اہل نظر کے قلوب میں ابھرا۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اقبال کی فکر کو اس حوالے سے بطور خاص دیکھا ہے۔ مغربی تمدن ہو یا اہل یورپ کے سیاسی افکار، اقبال نے انھیں کس طرح دیکھا، اس کا ایک جامع احاطہ ڈاکٹر تحسین فراقی کے ہاں نظر آتا ہے۔

"جمہوریت ـــــ اقبال کی نگاہ میں" کے عنوان سے اپنے مضمون میں جمہوریت کے بارے میں نظریاتِ اقبال کا احاطہ یوں کرتے ہیں:

> "اُن کے نظامِ فکر میں روحانیت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اُن کے تمام معاشی اور عمرانی تصورات اسی کے تابع ہیں۔ نظری طور پر وہ جمہوریت کے قائل ہوتے ہوئے بھی وہ اُس کی متعارف مغربی تعبیرات کے شدید ترین نقاد تھے۔ وہ اُس کا رشتہ وحیِ الٰہی سے جوڑ دینا چاہتے تھے۔"(۱۴)

ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنے اس مضمون میں جمہوریت کے بارے میں اقبال کی نمائندہ منظوم اور منثور تخلیقات کے حوالے دیے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے بطورِ خاص اقبال کے مضمون "Political Thought in Islam" سے چند شذرات نقل کیے ہیں۔ یہ شذرات مذکورہ مضمون کے اُس حصے میں دی گئی ہیں جو انتخابات کے بارے میں ہے۔ یہ حصہ بنیادی طور پر الماوردی کے خیالات کا خلاصہ ہے۔ الماوردی کے مطابق الیکشن میں امیدوار ذہنی و جسمانی طور پر صحت مند، قانون و فقہ کا عالم، صاحبِ بصیرت اور مرد ہو۔

جمہوریت کے سلسلے میں ایسے نکات جن پر افکارِ اقبال کی روشنی میں کوئی وضاحت موجود نہیں، ڈاکٹر تحسین فراقی نے اُن کا ذکر بھی کیا ہے۔ جن میں اسلام میں پارٹی بندی، ہر فرد کا ووٹ کا استحقاق اور طبقاتی سماج میں عادل قیادت کے ظہور کا مسئلہ قابلِ ذکر ہیں۔

نوآبادیاتی دور میں مغربی تمدن کے خلاف اکبر بھی نبرد آزما ہوئے اور اقبال نے اس مبارزت کو ایک تسلسل عطا کیا۔ اقبال کے نزدیک یورپی استعمار نے ایشیائی اور افریقی اقوام کو غلام بنایا اور اُن کا معاشی استحصال کیا۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اقبال کے نوآبادیاتی نظام سے متعلق تہذیبی، تمدنی اور سیاسی افکار کے احاطے کے لیے ایک اور اہم مضمون "مغربی تمدن کی یلغار اور فکرِ اقبال" رقم کیا ہے۔ کپلنگ (Kipling)، نطشے اور برانسکی ایسے اہلِ دانش کے تصورات نے اہلِ مغرب کو ایک فائق قوم کے زعم میں مبتلا کیا اور اقبال نے اس تکبرِ باطل کی گرفت اپنی تخلیقات میں جامع حوالوں سے کی۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے مذکورہ مضمون میں اس بارے میں مذکورہ تخلیقات سے معتبر اقتباسات نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "اقبال کی شعری و نثری تحریروں کے پورے سرمائے کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مغربی کلچر کے مثبت پہلوؤں کے اعتراف کے باوجود اُس کے منفی پہلو اقبال کے نزدیک مقدار میں کہیں بڑھے ہوئے ہیں۔ ان منفی پہلوؤں کے

اعلان و اظہار میں اقبال نے اپنے شعری وسائل سے کمال درجے کا کام لیا اور ملت اسلامیہ کو بالخصوص اور پوری نوع انسانی کو بالعموم اس سے بڑی دردمندی سے آگاہ کیا۔"(۱۸)

اقبال جمہوریت کے مثبت پہلوؤں کے مداح تھے اور مغربی ثقافت کے تلخ رساں حوالوں کے بھی تعریف کرنے والے۔ اس پہلو کی جانب ڈاکٹر تحسین فراقی نے بجا طور پر اشارہ بھی کیا لیکن اس سلسلے میں وہ کسی تفصیل میں بوجوہ نہیں گئے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس موضوع پر بھی جامع نوعیت کا تحقیقی کام کیا جائے تا کہ وہ ماحول جس کا خود اقبال کی فکری و تہذیبی پرداخت میں بڑا حصہ ہے، اُس کا وہ رخ بھی سامنے آ سکے، جسے ماہرین اقبال نے زیادہ اہمیت نہیں دی یا اسے بوجوہ نظر انداز کرتے رہے۔

۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد بہ ظاہر نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ ہو گیا لیکن ایسا ہرگز نہیں کہ یورپ کی استعماری حیثیت ختم ہو گئی۔

وطن عزیز کا خواب چونکہ خود اقبال نے دیکھا تھا، اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اُن کی دیدۂ بینا کے سامنے اس خطۂ ارض کے مستقبل کا نقشہ بھی ہوگا اور جس طرح وہ اہلِ ہندوستان کو نوآبادیاتی نظام کے ضرر رساں پہلوؤں سے آگاہ کرتے رہے نیز حرکت و عمل کے ذریعے اُن کے خلاف نبرد آزما ہونے کا پیغام دیتے رہے اسی طرح اُن کے افکار آج بھی اہلِ مشرق کو مغربی استعمار کے سلسلے میں ہوشیار رہنے کے سلسلے میں رہنما ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے خبرداری کے اس عمل کے لیے فکرِ اقبال کی عصری معنویت پر بھی بہت جامع مضامین رقم کیے ہیں جن میں اہلِ اسلام، اہلِ پاکستان اور اہلِ مشرق کی بیداری کے لیے افکارِ اقبال پر اپنے بصیرت افروز خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے درج ذیل مضامین بطورِ خاص لائقِ ذکر ہیں:

i۔ عصری مسائل اور فکرِ اقبال

ii۔ اقبال کا تصورِ تہذیب

iii۔ نیا نظامِ عالم اور فکرِ اقبال

iv۔ فکرِ اقبال کی عصری معنویت

v۔ علامہ اقبال اور اتحادِ عالمِ اسلامی

vi۔ عا☺یت کی صورتِ حال اور فکرِ اقبال

اوّل الذکر مضمون اگر چہ ان مسائل پر اقبال کے فکر و نظر کا احاطہ کرتا ہے جنھیں اقبال اپنے عصر میں دیکھ رہے تھے لیکن فی زمانہ چونکہ بعض مسائل انھی کا تسلسل ہیں لہٰذا یہ مضمون معاصر صورتِ حال پر بھی منطبق کیا جا سکتا ہے اور ڈاکٹر تحسین فراقی نے مضمون کے اختتام پر اِن مسائل کا ذکر بھی اس تناظر میں کیا ہے۔

معاصر عالمی فکری و تہذیبی مسائل اور زمینی حقائق کی روشنی میں کلامِ اقبال کو ڈاکٹر تحسین فراقی نے جن مضامین میں دیکھا ہے۔ وہ اُن کی کتاب "اقبال ــــ دیدۂ بینائے قوم" میں شامل ہیں اور غالباً اسی حوالے سے ان اوراق کو یہ عنوان بھی دیا گیا ہے۔

ان مضامین میں فکرِ اقبال کا عصری حوالوں سے مطالعہ کرتے ہوئے ڈاکٹر تحسین فراقی نے اقبال کی بصیرت پر حرفِ تحسین رقم کیا ہے۔ اُن کے نزدیک اقبال نظامِ عالم کو روحانی جمہوریت کی بنیاد پر استوار کرتے ہیں۔ وہ جمعیت اقوام کے بجائے جمعیت عالم کے علمبردار ہیں۔ فی زمانہ چونکہ نئے نظام عالم (New World Order) کی بحث زور پکڑ چکی ہے اور اس سلسلے میں عا☺یت کی فکری بنیادوں پر ایک خاص استحصالی عالمی نظام تشکیل دینے کی کوشش کی جارہی ہے اس تناظر میں اقبال عالمی نظام کو جن تصورات کی بنیادوں پر استوار کرنے کے خواہاں ہیں انھیں ممکن ہے بعض معاصر دانشور ایک رومانوی خواب یا یوٹوپیا قرار دیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقبال کا خواب ایسا نہیں کہ جس کی تعبیر نہ تلاش کی جاسکے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کے بقول ماضی میں بھی عظیم اہلِ قلم نے ایسی نصب العینی بستیوں کے خواب دیکھے اور یہی اہلِ قلم کا منصب ہے۔ گلگامش (Gilgamesh) کا رزمیہ ہو یا ہومر کی اوڈیسی عالمی کلاسیکی ادب میں یہ خواب دیکھے گئے اور دیکھے جاتے رہیں گے اور اقبال کے تصورات انھی خوابوں کا ایک تسلسل ہیں۔

کلامِ اقبال ایک بھرپور عصری معنویت رکھتا ہے، جب بھی سماجی استحصال اور معاشرتی ناہمواری کے مسائل سامنے آئیں گے، اقبال کی فکر اس کے خلاف مزاحمت کے اسباب باہم پہنچاتی رہے گی۔

سماجی استحصال اور دنیا کے غریب ممالک کی معیشت پر قبضے کی ایک صورت عالم کاری (Globalization) کی شکل میں سامنے آئی ہے۔ جس نے عالمی سطح پر نہ صرف معاشیات کو متاثر کیا ہے بلکہ سیاست اور عالمی تعلقات عامہ کو بھی متاثر کیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ مقولۂ وقت اور تاریخ کے خاتمے جیسے تصورات کو بھی پذیرائی ملی ہے۔ یہ ایک ایسا نوآبادیاتی نظام ہے جس نے کسی ایک یا چند اقوام کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیا بلکہ یورپ، امریکہ اور دیگر دولت مند اقوام کی بے لگام ہوا و ہوس کو تکمیل کے

منظوم ذرائع فراہم کیے ہیں۔

اقبال کا کلام ما ☺ یت کی معاصر صورت حال کا کس طرح احاطہ کر رہا ہے، اس اہم فکری نکتے پر ڈاکٹر تحسین فراقی نے "ما ☺ یت کی صورت حال اور فکرِ اقبال" کے عنوان سے بہت ہی فکر انگیز مضمون رقم کیا ہے۔ اس مضمون میں مذکورہ صورت حال پر نوم چومسکی، مہاتیر محمد، ضیا الدین سردار، میرل وین ڈیویز اور جارج آر ویل ایسے اہلِ دانش کے افکار کا جائزہ لیتے ہوئے یورپ اور امریکہ کے چنگیز سے تاریک تر باطن کا نقش واضح کیا ہے۔ ہسٹن سمتھ کے بقول بیسویں صدی کی یہ وہ صورت حال ہے جس میں ڈسٹوپیا (Dystopia) نے یوٹوپیا (Utopia) کی جگہ لے لی ہے۔ دنیا اب ایسی جگہ بنتی جارہی ہے جہاں ہر شے بری ہے۔

اقبال کی دیدۂ بینا نے اس صورت حال کا بہت پہلے ادراک حاصل کر لیا تھا۔ چنانچہ ان کی منظومات بہ طورِ خاص "خضرِ راہ" اور "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" پڑھی جائیں تو وہ ما ☺ یت کے معاصر عالمی تشکیک و وہمِ خطر بتاتے نظر آتے ہیں۔

جدید نظامِ عالم کے تناظر میں ڈاکٹر تحسین فراقی افکارِ اقبال کے بارے میں کیا تجزیات پیش کرتے ہیں۔ اُن کا ایک عکس درج ذیل آرا میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

> "امریکہ اور مغرب کی نئی استعماری ترکتازیاں اسی خطرے کی پیش بندی اور کمزور ممالک کے قیمتی معدنی وسائل کو ہڑپ کرنے اور ان کی روشن تہذیب و روایات کو برباد کرنے کا نقطۂ آغاز ہیں۔ اقبال نے "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں بہت پہلے واضح کر دیا تھا کہ ابلیسی نظام کو اشتراکیت سے نہیں صرف اسلام سے خطرہ ہے۔"(۴۸)

> "جب تک دانشِ حاضر اور اس کے اوضاع، مادہ پرستی، جاہ طلبی، جوع الارض، معاشی استحصال اور معاشرتی ناہمواریوں اور دیگر جاتی، فکری اور روحانی مفاسد کا الم ناک منظر نامہ نوعِ انسانی کی نگاہوں سے کاملاً ہٹ کر ملیامیٹ نہیں ہو جاتا اور جب تک عشق اور اس کی اضطراب انگیزیاں لوحِ کائنات سے محو نہیں ہو جاتیں، اقبال کے فکر و جذبہ کی عصری معنویت برقرار رہے گی۔"(۴۹)

> "اقبال جیسا بالغ نظر، روشن دماغ اور اپنی انگلیوں کی پوروں تک نوعِ انسانی کے

درد سے سرشار، معاشی خود انحصاری کا علم بردار اور ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کا خواب دیکھنے والا شاعر دیا آتیں بھی ایک اور طرح کی عا☺یت، ایک مختلف نئے ورلڈ آرڈر کا روشن اور نشاط انگیز تصور رکھتا تھا مگر اس کے لیے وسعت نگاہ کی شرط لگاتا تھا اور حق یہ ہے کہ یہ وسعت نگاہ اعلیٰ روحانی تصورات اور خالص تصور توحید ہی کا فیضان ہے۔ اس کا خیال تھا اور کس قدر درست خیال تھا کہ:

دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اُٹھتے
نگاہوں میں اگر پیدا نہ ہو انداز آفاقی

اپنے چھٹے خطبے "الاجتہاد فی الاسلام" کے آخر میں اقبال نے بڑی صراحت کے ساتھ کہا تھا:

"Believe me Europe today is the greatest hindrance in the way of man's ethical advancement."

مجھے یقین ہے کہ اگر اقبال آج زندہ ہوتے تو یورپ کا نام کاٹ کر اس کی جگہ امریکہ کا نام لکھ دیتے کہ عا☺یت کی علمبردار اس واحد عالمی قوت نے اس دھرتی، اس عالم کی بقا پر ایک بڑا سوالیہ نشان قائم کر دیا ہے۔"(۳۳)

برطانیہ کا نوآبادیاتی نظام ہو یا امریکی استعماری زنجیر، افکار اقبال میں ہر دو صورت حال سے نجات کا واحد راستہ احکام الٰہی کی پابندی کرتے ہوئے عالمی اتحاد امت ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری اور نثر کے پیرایہ اظہار میں اسی نکتے پر زور دیا ہے کہ "نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر" مسلمان ایک وحدت میں پروئے ہوئے ہوں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کے بقول:

"اگر یہ سوال کیا جائے کہ اقبال کی تمام شعری و نثری تحریروں اور خود ان کی سراپا درد مند و بے قرار زندگی کا خلاصہ اور ماحصل کیا ہے تو اسے ایک جملے میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔ "ملت اسلامیہ سے بے پناہ عشق اور عالم اسلام کے اتحاد و یگانگت کی نا مختتم آرزو۔"(۳۴)

معاصر عا☺یت کی صورت حال میں امت مسلمہ کے احیا کی ممکن صورت کیا ہو سکتی ہے؟ ڈاکٹر تحسین فراقی اس سوال کو سامنے رکھتے ہوئے افکار اقبال کا جائزہ لیتے ہیں تو شعر و نثر کے علاوہ ان کی نظر

عمیق اُن مکاتیب تک بھی جاتی ہے جن میں اقبال مسلم نشاۃ الثانیہ کے حوالے سے اہلِ نظر سے تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ ۲۸ جولائی ۱۹۲۱ء کو اقبال نے جناب راغب احسن کے نام خط میں ایک خواب کی روداد سناتے ہوئے بتایا کہ مدت ہوئی میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک سیاہ پوش فوج عربی گھوڑوں پر سوار ہے۔ مجھے تفہیم ہوئی کہ یہ ملائکہ ہیں۔ میرے نزدیک اس کی تعبیر یہ ہے کہ ممالکِ اسلامیہ میں کوئی جدید تحریک پیدا ہونے والی ہے۔ عربی گھوڑے سے مراد روحِ اسلاف ہے۔

بلاشبہ روحِ اسلاف ہمارے لیے ممد و معاون ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا محض بزرگوں کی یہ روحیں ایسی مدد کر سکتی ہیں کہ ملتِ اسلامیہ کو ایک بار پھر احیائے عالمی نصیب ہو۔ کیا بغیر فردِ عمل ترقی کی کوئی صورت نکل سکتی ہے؟ ڈاکٹر تحسین فراقی انھی سوالات کو سامنے رکھتے ہوئے فکرِ اقبال میں حرکت و عمل کے فلسفے کو تلاش کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک اقبال نے بہت پہلے عربوں کو فرنگی سازشوں سے خبردار کر دیا تھا، وہ آج بھی یہ امت اپنی فردِ عمل کو چشمِ بینا سے دیکھ لے تو وہ دن دور نہیں جب نشاۃ الثانیہ کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوگا۔

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

فکرِ اقبال کا منبع، اُن کا شعری کلام اور خطبات ہیں "Reconstruction of Religious Thought in Islam" کے عنوان سے آپ کے سات خطبات شائع ہوئے ہیں اور اُن کے اُردو تراجم بھی کیے جا چکے ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے فکرِ اقبال کے مباحث میں مذکورہ خطبات میں سے درج ذیل تین خطبات پر جامع گفتگو کی ہے:

i. "The Conception of God and the Meaning of Prayer."

ii. "The Principle of Movement in Structure of Islam."

iii. "The Spirit of Muslim Culture."

''تصورِ الٰہ اور عبادت کا مفہوم'' اقبال کا ایک اہم خطبہ ہے جس میں انھوں نے خالقِ کائنات کے بارے میں بعض فکری تصورات کی نفی کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ وہ محض خالق نہیں بلکہ ہر زماں اور ہر مکاں کا ناظر و ناظم بھی ہے اور اُس کی عبادت کسی نوع کا انفعالی عمل نہیں ہونا چاہیے کہ عبادت کی اصل عرفانی عمل سے جڑی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس خطبے کا جائزہ اجمالی طور پر لیا ہے تاہم خطبے کے دونوں اہم نکات کی شرح جامع اسلوب میں کی ہے۔ ذیل کے دو نکتے ملاحظہ ہوں:

"خدا روح الارواح ہے۔ اپنے بندوں سے الگ نہیں۔"(۳۳)

"ہر سچی عبادت اصلاً عمرانی ہوتی ہے۔ اجتماع کی صورت میں انسان کی قوت
ادراک کو مہمیز لگتی ہے۔"(۳۴)

اقبال ایک خرد افروز اور روشن خیال مفکر تھے۔ اُن کے نزدیک دینی تصورات جامد نہیں بلکہ اپنے باطن میں تحرک رکھتے ہیں۔ ۱۹۲۹ء میں دیا گیا اُن کا خطبہ جس میں انھوں نے پارلیمان کو حق اجتہاد دینے کے عمل کو بہت پسند کیا ہے، اُن کے تصورات کی تفہیم کے سلسلے میں بہت اہم ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس خطبے کا جائزہ بعض معروضی حقائق کی روشنی میں لیا ہے۔ ان کے تجزیے میں ان حقائق سے جڑے بعض تلخ واقعات پر بھی توجہ کی گئی اور اُن کے تناظر میں اقبال کے تصورات اجتہاد کو حال کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

اس خطبے کے تجزیے میں وہ اقبال کے افکار کے شارح سے زیادہ معروضی حالات کے کڑے ناقد نظر آتے ہیں اور وہ ان حالات کی روشنی میں اقبال کے تصورات اجتہاد اور فکرِ جمہوری کے سلسلے میں اپنے بعض اندیشوں کا کھل کر اظہار کرتے ہیں اور یہاں تک کہتے ہیں:

"اقبال اگر آج زندہ ہوتے تو ہماری قانون ساز اسمبلیوں کی ایسی افسوس ناک
کارکردگی کو دیکھ کر اپنی تجویز یا تو واپس لیتے یا کم از کم موقوف کر دیتے۔"(۳۵)

اقبال کے افکار اجتہاد یا تصورات جمہوری بہت اہم ہیں اور اس خطبے میں انھوں نے نہایت زیرک دانشور کی طرح احکامات شرعی کو مستقبل کے معروضی تقاضے کے تناظر میں دیکھا ہے۔ اب معروضی تقاضے میں بعض مسائل پیدا ہوئے ہیں تو اُن کا تدارک ضروری ہے اور اگر اقبال زندہ ہوتے تو اس عمل تدارک میں اپنا فکری حصہ ضرور شامل کرتے۔

اقبال کے افکار میں جو تحرک موجزن نظر آتا ہے وہ اسے مسلم سماج میں بھی دیکھنے کے متمنائی تھے۔ لہٰذا دین اسلام سے وابستہ ہر اُس تصور کو جو جامد پن یا انفعالیت کی جانب راغب کرے، اقبال اُس پر تنقید کرتے ہوئے اسلامی فکر کی روح کو ایک حیات نو بخشنے کی سعی کرتے تھے۔ یہی کوشش اُن کے خطبے "اسلامی ثقافت کی روح" میں نظر آتی ہے جس میں وہ یہ واضح کرتے ہیں کہ اسلام میں تصورِ حیات فکر اور عمل ہر دو سطح پر حرکی ہے اور اس کی بنیاد اُس شعورِ نبوت پر ہے کہ معراج پر تشریف لے جا کر آپ ﷺ نے خدا سے مل کر بھی تخلیق خدا کی جانب مراجعت ضروری گنی۔ وہ جملہ اہم فکری تصورات جو اہلِ یورپ

کا امتیاز سمجھے جاتے ہیں، ماضی میں اُن کا اظہار خود مسلم فلاسفہ کے ہاں نظر آتا ہے۔ ڈارون کے نظریہ ارتقا کے متعارف ہونے سے بہت پہلے یہ خیال مسلم فلسفی ابن مسکویہ نے اپنی کتاب "فوز الاصغر" میں اور رومی نے اپنے اشعار میں پیش کیا۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس خطبے میں اقبال کے تصورات کی عالمانہ تشریح کرتے ہوئے بہت عمدہ قرینے سے ان الفاظ میں سمیٹا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "وہ مسلم کلچر کو کوئی جامد اور منجمد شے نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کے نزدیک مسلم کلچر نہ صرف زمانے کی رو کا شریک ہے بلکہ اس کا رخ متعین کرنے والا ہے۔ مسلم کلچر نہ صرف جمال کا حامل ہے بلکہ جلال سے بھی اتنا ہی فیض اندوز ہے بلکہ میرا خیال ہے کہ شاید اقبال کے ہاں جلال کی لے کچھ بڑھی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔" (۲۰)

اقبال کی فکری دنیا کی وسعت کو روایت کے تناظر میں دیکھیں تو انھوں نے اردو کی شعری روایت کے ساتھ عربی، فارسی، انگریزی اور ہندی ادبوں سے بیک وقت بہت اثر قبول کیا اور انھی تمام اثرات کو اپنے باطن میں جذب کرتے ہوئے خود ایک الگ روایت کو جنم دیا۔ اس کے علاوہ اس حقیقت سے بھی روگردانی ممکن نہیں کہ انھوں نے مذکورہ شعری روایتوں کے ساتھ فلسفیانہ افکار کے جہانوں کی بھی خوب سیر کی اور پھر فکر و نظر کے ایک الگ عالم کو خود تشکیل دیا۔

اقبال کے ہاں بقول ڈاکٹر تحسین فراقی "تتبع زیر گوشۂ یا لختم" کے کئی شواہد ملتے ہیں اور اُن کی فکری اساس کو عرب، عجم اور افرنگ کے اہلِ فکر کے تناظر میں دیکھیں تو مماثلت و اختلاف کے کئی ایک پہلو بھی نکلتے ہیں۔ مذکورہ اہلِ دانش کے افکار اقبال کے ہاں رد و قبول کے عمل سے بھی گزرتے ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے اقبال کے افکار کا جن دیگر اہلِ شعر و دانش کے تصورات سے تقابل کیا ہے یا مماثلتیں تلاش کی ہیں۔ اُن میں عربی شاعر ابو العلا معرّی، فارسی شعرا رومی، بیدل اور ممتاز فلسفی ہیگل قابلِ ذکر ہیں۔

ابو العلا معرّی دورِ عباسی کا شاعر تھا اور اُس کا شمار اُن شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے مذہبی پیشواؤں کی "استعماریت" کو بیباک و دلیل انکار، حالانکہ وہ خود نہ تو لاادری تھا نہ ملحد۔ البتہ بعض مذہبی روایات کے کھوکھلے پن سے شدید نالاں ضرور تھا۔ اپنے ان افکار کی وجہ سے اُسے ایک لادین سخنور کے طور پر جانا گیا۔ بعض حوالوں سے دیکھا جائے تو خود اقبال نے بھی دین فروش صوفیوں اور ملاؤں کے خلاف خوب

خوب لکھا اور انھیں بھی لاد CRS و کفر کے فتووں کا سامنا کرنا پڑا۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے ابوالعلا معری کے مابین جن فکری مماثلتوں کو تلاش کیا ہے اُن میں مذہبی پیشواؤں کے استحصال، مقتدر سماجی طبقات اور افراد پر طنز و تعریض، عالم لاہوت کا تخیلی سفر اور تصورات زمان و مکاں شامل ہیں۔ یہ مضمون نہایت دلچسپ اور عالمانہ ہے جس میں فکری حوالوں کے علاوہ بعض شخصی صفات کے اشتراکات بھی ظاہر کیے گئے ہیں اور شعری و فنی صفات بھی۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کے بقول:

> "دونوں مفکر شاعر تھے۔ دونوں کے یہاں فکر اور جذبے کی خوبصورت آمیزش ملتی
> ہے۔ فلسفہ و جذبات کا نادر امتزاج نظر آتا ہے۔ پھر یہ بھی کہ دونوں کے یہاں
> فلسفہ اور شاعری ایک دوسرے کو Overlap کرتے نظر آتے ہیں۔ اس لیے
> اقبال کے سلسلے میں نقادوں کو جس دشواری کا سامنا کرنا پڑا ایسی ہی مشکل معری
> کے نقادوں کو بھی پیش آئی۔"(۲۸)

اقبال نے فارسی کی شعری روایت میں جس شاعر سے فکری استفادہ کیا اور اپنی روحانی اور تہذیبی جرأت پر انبساط بھی ظاہر کیا وہ مولانا جلال الدین رومی ہیں۔ اقبال نے اپنی نظم و نثر میں اُن کا ذکر تواتر سے کیا اور ہر بار ایک والہانہ پن اور عقیدت کا پرتو واضح نظر آتا ہے۔ "اقبال کے شعر و فلسفہ پر رومی کے اثرات" کے عنوان سے اپنے مضمون میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے اُن فکری عناصر کا تعین کیا ہے جن میں اقبال پر فیضانِ رومی واضح نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے تصورِ انسان، تصورِ خودی و بے خودی اور تصورِ عشق پر بطورِ خاص لکھا ہے۔ اس کے علاوہ بعض علامات خصوصاً شاہین کی علامت کے اشتراک کا پہلو بھی مختصراً واضح کیا ہے۔ اقبال نے عصری آشوب کے حوالے سے اپنے چوتھے خطبے میں عہدِ حاضر میں کسی رومی کے ظہور پر زور دیا ہے اور نوجوانوں کا فکری علاج بھی آتشِ رومی کے سوز میں تلاش کیا ہے۔
اس پس منظر میں ڈاکٹر تحسین فراقی اپنے مضمون کا اختتام اس سوال پر کرتے ہیں:

> "کیا یورپ اور خصوصاً امریکہ میں رومی کی روزافزوں اور حیرت انگیز مقبولیت کا
> سبب یہی تو نہیں کہ روحانی طور پر بنجر اور باطنی سطح پر کھوکھلی تہذیب کے فرزندوں
> کو رومی کی صورت میں ایک ایسا نجات دہندہ دکھائی دیا ہے جو ان کے اندر کی
> تشنگی کو بجھانے کا سروسامان کرسکتا ہے اور ان کے باطن میں آتشِ شوق کی
> چنگاری روشن کرسکتا ہے کہ یہی کام روشن ضمیر مفکرات تہذیبوں کے بجھتے

چراغوں کو سہارا دینے کے لیے ہر دور میں کرتے رہے ہیں۔"(۲۸)

مرزا عبدالقادر بیدل سے اقبال کے فکری و اسلوبی اشتراکات پر ڈاکٹر تحسین فراقی نے اقبال کی تصنیف "مطالعۂ بیدل ـــ فکر برگساں کی روشنی میں" کے دیباچہ میں مختصر مگر جامع اسلوب میں اپنے خیالات کا کیا ہے۔

اقبال کی یہ مختصر تصنیف انگریزی میں "Bedil in the light of Bergson" کے عنوان سے ہے جسے ڈاکٹر تحسین فراقی نے مرتب کر کے اقبال ریویو کے اکتوبر دسمبر ۱۹۸۶ء کے شمارے میں شائع کیا اور بعد ازاں ۱۹۸۸ء میں یہ کتابی صورت میں منظر عام پر آئی۔

اس تصنیف کے دیباچے میں جہاں برگساں کی فکر کے بعض اہم پہلوؤں خصوصاً وجدان اور حرکی تصور حیات پر روشنی ڈالی گئی ہے وہاں اس تناظر میں اقبال اور بیدل کے مابین بھی فکری اشتراک کی جستجو کی گئی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> "دونوں عظیم شعرا وجدان ہی کو وہ معیار اور وسیلہ قرار دیتے ہیں جس کی مدد سے کائنات کی تفہیم ممکن ہے۔ دونوں کا موقف یہ ہے کہ مجرد اور نری فکری عقل پرستی سے کام نہیں چلتا۔"(۲۹)

اس طرح صوفیانہ تصورات کے حوالے سے اقبال اور بیدل کے مابین فکری اشتراک کے ضمن میں لکھتے ہیں:

> "اقبال اور بیدل دونوں تصوف کی اُن صورتوں کو افراد ملت کے لیے خطرناک تصور کرتے تھے جنھوں نے شریعت کی تکالیف اور تقاضوں کو پس پشت ڈال کر ایسی طریقت کا جواز مہیا کر دیا تھا جو ایک طرف بہانۂ بے عملی ثابت ہوئی اور دوسری جانب دین میں ایسی بدعات ظہور میں آئیں جو روح اسلام کے منافی تھیں۔"(۳۰)

بیدل کے ساتھ اقبال کے فکری اشتراکات ہی نہیں بلکہ فنی سطح پر فن کے ہاں بہت سی ایسی تراکیب بھی نظر آتی ہیں جو بیدل کی طبع ایجاد پسند کا فیضان ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عبدالغنی نے اپنی کتاب "Life and works of Abdul Qadir Bedil" میں بھی ایسی تراکیب کی طویل فہرست درج کی ہے۔
شرح اسرار خودی میں یوسف سلیم چشتی نے اقبال کا ایک قول نقل کیا ہے جس کے مطابق شعر

اچاریہ، ابن عربی، بیدل اور ہیگل ایسی ہستیاں ہیں کہ ان میں سے کسی کے طلسم میں کوئی گرفتار ہو جائے تو رہائی مشکل سے ملتی ہے۔

جرمن اہلِ شعر و دانش ہیگل اور گوئٹے سے متاثر ہونے کا اعتراف اقبال نے اپنی ڈائری "Stray Reflections" میں بھی کیا ہے اور انھوں نے اپنے روزنامچے میں ہیگل کے ضمن میں لکھا بھی ہے۔

اقبال اور ہیگل کے مابین فکری اشتراک کا تجزیہ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اقبال کے ذہنی ارتقا کے تناظر میں کیا ہے۔ اُن کے بقول اقبال ابتداً ہیگل سے بہت متاثر تھے اور اس کی وجہ ہیگلی فکر کے مؤید میک ٹیگرٹ تھے جن سے اقبال زمانۂ طالب علمی میں مستفید ہوئے لیکن ۱۹۲۰ء کے بعد وہ ہیگل کی بے آمیز مداحی کے سحر سے آزاد ہو گئے۔ اس کا واضح مظہر "ہیگل" کے زیرِ عنوان اُن کے دو فارسی شعر اور ایک نظم: "ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام" بھی ہیں۔ اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اقبال ہیگل کے سحر سے نکل نہیں پائے۔ "ساقی نامہ" میں انھوں نے جس طرح زندگی کو ایک رواں دواں بلکہ تیز رو ندی سے تشبیہ دی ہے، ڈاکٹر تحسین فراقی فکرِ اقبال پر ہیگل کے اثرات کے حوالے سے اس نظم کے تناظر میں بجا طور پر استفسار کرتے ہیں:

> "کیا ساقی نامہ کے یہ اشعار لطیف تخلیقی پیرائے میں ہیگل کی جدلیات کے مظہر نہیں۔ ہیگل کے نزدیک بھی حیات جامد نہیں، حرکی ہے۔ اسی طرح خیال بھی ایک حرکی عمل سے عبارت ہے، حقیقت بھی ایک حرکی عمل ہے۔"(۳۰)

مضمون کے اختتام پر ڈاکٹر تحسین فراقی نے اقبال کے اس حرکی تصور کو ہیگل کے تصور سے زیادہ زندگی افزا، حیات افروز اور ابدی قدر و قیمت کا حامل قرار دیا ہے۔ یہ زندگی افزائی بھی ہیگل ہی کا فیضان ہو سکتا ہے کہ اُن سے اثر قبول کرنے والے اہلِ فکر نے زندگی کے عمل کو مزید متحرک اور فعال پیرائے میں دیکھا۔

اقبال نے اپنے افکار کا اظہار جہاں اپنی شعری و نثری تصانیف میں کیا، وہاں اہلِ دانش و [illegible] کے نام مکاتیب کے ذریعے سیاسی، تہذیبی اور ادبی مسائل پر تبادلۂ خیال بھی کیا۔ آپ کے مذکورہ خطوط کے اب تک کم و بیش ۱۵ مجموعے مختلف صورتوں میں شائع ہو چکے ہیں تاہم جامعیت کے اعتبار سے شیخ عطاء اللہ کا "اقبال نامہ"، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کا "خطوطِ اقبال" اور سید مظفر حسین برنی کا "کلیاتِ مکاتیبِ اقبال" بہت اہم ہیں۔ ان مجموعوں کی ترتیب و تدوین بہت حوصلہ افزا علمی کارنامے کی حیثیت

رکھتی ہے اور ان کے ذریعے اقبال کے وہ فکری مباحث جو نجی تحریروں میں محفوظ تھے منصۂ شہود پر آئے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ پہلو قدرے افسوس ناک ہے کہ بعض مرتبین و مدوّنین کہیں کہیں متن کی صحت کے سلسلے میں فاش غلطیوں کا ارتکاب کرتے ہیں جن کے باعث یہ متون صحت کے لحاظ سے کمزور اور بعض مقامات پر مشکوک قرار پاتے ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کی اقبال شناسی کا ایک بڑا اہم پہلو مکاتیب کے مذکورہ مجموعوں پر آپ کی گہری نظر ہے۔ خطوط کی تدوین کے مطالعات تحسین یہ ثابت کرتے ہیں کہ اقبال کے رقم کردہ حروف سے اُن کا کس قدر انسلاک ہے اور ان کی نگارش چاہے، اُس کی نوعیت کچھ بھی ہو، اُس کی پوری صحت کے ساتھ مطالعہ اور حفاظت کا فریضہ اُن کے نزدیک اہم ہی نہیں ایک حساس معاملہ بھی ہے۔

"اقبال نامہ" مرتبہ شیخ عطاء اللہ کی پہلی جلد ۱۹۴۴ء میں جبکہ دوسری جلد ۱۹۵۱ء میں منظر عام پر آئی۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے دونوں جلدوں کا مطالعہ نہایت باریک بینی سے کیا اور اُن جملہ اغلاط کی نشان دہی کی جو اس کے متن میں موجود تھیں۔ ۲۰۰۵ء میں اقبال اکیڈمی، لاہور نے مذکورہ اغلاط کو سامنے رکھتے ہوئے دونوں جلدوں کو یکجا کر کے اس اعلان کے ساتھ شائع کیا کہ "اقبال نامہ" کی اس یک جلدی اشاعت کے لیے جناب ڈاکٹر تحسین فراقی کی تحقیق و تصحیح متن کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ لیکن یہ امر نہایت افسوس ناک ہے کہ ادارے کا یہ دعویٰ درست معلوم نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے جن اغلاط کی جانب نشان دہی کی۔ اُن کی تفصیل درج ذیل ہے:

"۱۔ بعض مکاتیب کی تاریخیں غلط ہیں۔ مثلاً انور شاہ کاشمیری کے نام خط کی تاریخ ۱۹۲۵ء ہے، نہ کہ ۱۹۳۵ء۔

۲۔ بعض مکاتیب کے مکتوب الیہم وہ نہیں جو دراصل تھے۔ یوں انتساب کی جو غلطیاں راہ پا گئیں، وہ ایک مدت تک دہرائی جاتی رہیں۔ مثلاً اقبال نامہ میں عشرت رحمانی کے نام خط دراصل میر حسن الدین مترجم "فلسفۂ عجم" کے نام ہے، مولوی طالع کے نام خط سردار ایم بی احمد کے نام ہے، فوق کے نام خط مولوی انشاء اللہ خاں مدیر وطن کے نام ہے اور اختر شیرانی کے نام خط دراصل ان کے والد حافظ محمود شیرانی کے نام ہے۔ لمعہ کے نام اکثر خطوط جعلی ہیں یا کم از کم ان میں تحریف ضرور کی گئی ہے۔

۳۔ بعض مصالح کی بنیاد پر متن میں قطع و برید کی گئی ہے۔ مثلاً راس مسعود، مولوی عبدالحق اور اکبر منیر کے نام خطوط میں۔

۴۔ بعض مکاتیب متن کے اعتبار سے ادھورے ہیں۔ مثلاً مولوی عبدالحق کے نام ۹ ستمبر ۱۹۳۷ء کا خط یا عطیہ فیضی کے نام ۹ اپریل ۱۹۰۹ء کا خط۔ علاوہ ازیں غلام قادر گرامی کے نام خط مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۸ء۔ ان خطوں میں کہیں تو چند سطریں یا کہیں ایک آدھ پیرا چھوڑ دیا گیا ہے مگر انشاء اللہ خاں مدیر وطن کے نام خط میں جو "اقبال نامہ" جلد دوم، ص ۲۹۵ پر محمد دین فوق کے نام سے درج ہے، اکٹھے چھ صفحے نامعلوم وجوہ کی بناء پر چھوڑ دیے گئے ہیں۔ مکمل متن کے لیے خطوط اقبال (مرتبہ رفیع الدین ہاشمی)، ص ۹۸ تا ۱۰۳ ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

۵۔ بعض انگریزی خطوں کا ترجمہ بہت ناقص ہے۔ مثلاً "اقبال نامہ" جلد اوّل میں نکلسن کے نام خط اور جلد دوم میں عطیہ کے نام اقبال کے بعض مکاتیب مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔

۶۔ بعض خط دراصل اُردو میں ترجمہ کر کے شامل کیے گئے مگر اس کی وضاحت نہیں کی گئی۔ مثلاً "اقبال نامہ" جلد دوم ص ۳۳۵ (مکتوب بنام عبداللہ چغتائی مورخہ ۲۹ اپریل ۱۹۲۷ء)

۷۔ بعض جگہ متن میں غیر شعوری طور پر تحریف ہو گئی ہے۔

۸۔ کہیں کہیں متن کے اندر ہی حواشی لکھ دیے گئے ہیں، حالانکہ ان کا محل یا تو آخر میں ہوتا ہے یا پاورق میں۔ مثلاً "اقبال نامہ" جلد دوم، صفحات ۱۲۹، ۱۳۱۔

۹۔ بعض اصل خطوں میں بعض لفظ (یا ایک آدھ جملہ) موجود نہیں لیکن نقلِ حرفی میں بوجوہ راہ پا گئے ہیں۔ مثلاً "اقبال نامہ" جلد اوّل میں پروفیسر غلام مصطفی تبسم کے نام خط میں (ص ۹۰) یا سید سلیمان ندوی کے نام ۲۲ جنوری ۱۹۳۲ء کے خط اور متعدد دیگر خطوط میں مثلاً "اقبال نامہ" جلد اوّل میں "اس طویل خط کے لیے معافی چاہتا ہوں" اصل متن میں نہیں۔

۱۰۔ نقلِ حرفی میں متعدد مقامات پر افراد و کتب کے نام غلط درج ہو گئے ہیں،

چنانچہ ابن ندیم ابن حزم بن گیا، محمد دارابی محمد دارال بن گیا، مختر تفسیر بن گیا اور سمتائی سنجائی، نیز Lewes، Larwss بن گیا اور ہیری بیگ ہیری بیگ بن گیا۔

۱۱۔ بعض خطوں میں مفرد الفاظ ترکیب کی صورت اختیار کر گئے ہیں، جبکہ اصل متن میں ایسا نہیں۔ اس وجہ سے مفہوم یا تو خبط ہو گیا ہے یا اس کے ابلاغ میں رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے۔ مثلاً سید سلیمان ندوی کے نام ۳۰/۲۰ اکتوبر ۱۹۱۹ء کے خط میں حرکت اور متواری کے مفرد الفاظ ترکیب اختیار کر کے "حرکت متوازی" بن گئے ہیں اور قاری کے لیے الجھن پیدا کرتے ہیں۔

۱۲۔ بعض جگہ اصل متن کے علی الرغم نقل حرفی میں اصل ترتیب قائم نہیں رکھی گئی۔ مثلاً اگر اقبال نے والسلام کے بعد پس نوشت کے طور پر چند جملے لکھے، تو اُسے بھی مندرجہ بالا متن میں شامل کر لیا گیا۔ یہ غلطی متعدد مقامات پر دہرائی گئی ہے۔

۱۳۔ بعض مقامات پر آیات قرآنی اور متعدد عربی عبارات بھی صحت متن سے عاری ہیں۔ مثلاً "اقبال نامہ" جلد اول، ص ۳۱ یا مثلاً "اقبال نامہ" جلد دوم، ص ۳۹

۱۴۔ بعض مقامات پر شعر اور مصرعے غلط درج ہو گئے ہیں۔ مثلاً "اقبال نامہ"، جلد اول، ص ۱۹۱ اور ص ۳۳۸

۱۵۔ مرتب نے نقل حرفی کے ساتھ اصل متن کا عکس بھی کہیں کہیں شامل کیا ہے مگر حیرت یہ ہے کہ وہاں بھی اصل متن کی صحت کے ساتھ پیروی نہیں کی گئی۔ اس ضمن میں حافظ اسلم جیراجپوری کے نام ۱۷ مئی ۱۹۱۹ء کا خط (اقبال نامہ، جلد اول، ص ۵۰) ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی جلد اول میں محمد رمضان عطائی کے نام اقبال کے ایک خط کا عکس شامل کیا گیا ہے مگر متن کے ناقص اور سہل آثار مطالعے کے نتیجے میں دو بیتی اس طرح درج ہو گئی:

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روز محشر عذر ہائے من پذیر
ور اگر بینی حسابم ناگزیر
از نگاہ مصطفیٰ پنہاں بگیر

اصل متن کے عکس میں صاف لکھا ہے "ور حسابم را تو بینی ناگزیر"۔۔۔ الخ۔
مرتب نے یہ نہ سوچا کہ "ورا گزیر" کی تکرار بے معنی ہے اور اقبال اس طرح کی
فاش غلطی کا ارتکاب نہیں کر سکتے تھے۔"(۳۲)

اقبال کے خطوط کی تدوین کے سلسلے میں دوسرا اہم کام مظفر حسین برنی کا ہے جنھوں نے چار جلدوں پر مشتمل "کلیات مکاتیب اقبال" حواشی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ مگر جو خطوط "اقبال نامہ" میں شائع ہوئے تھے، انھیں اُسی حالت میں نقل کر دیا گیا۔ یوں بیشتر اغلاط کی اس مجموعے میں بھی تکرار واضح ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے کلیات کی تیسری جلد کا مفصل تحقیقی مطالعہ کیا ہے اور مذکورہ اغلاط کے علاوہ بعض دیگر امور کی جانب بھی توجہ دلائی ہے۔ اُن کا یہ تحقیقی مطالعہ و تجزیہ جہاں اُن کی نگاہ باریک بین کا ثبوت ہے، وہاں یہ افسوس ناک پہلو بھی سامنے آتا ہے کہ نشترِ تحقیق کے کند ہونے کی جو شکایت اقبال نے کی تھی، اُس کا تسلسل خود اقبال شناسی کے عمل میں بھی موجود ہے۔

"کلیات مکاتیب اقبال" کی تیسری جلد کی بابت ڈاکٹر تحسین فراقی نے جن اغلاط اور کوتاہیوں کی جانب نشان دہی کی ہے۔ وہ درج ذیل ہیں:

"۱۔ خطوط کے جو عکس دیے گئے ہیں ان میں سے بعض کو بغور دیکھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ انھیں Retouch کیا گیا ہے اور چونکہ قیاساً کیا گیا ہے اس لیے بعض الفاظ میں تحریف ہوئی ہے۔ مثلاً ۳؍اگست ۱۹۳۳ء کے نذیر نیازی کے نام خط کے عکس میں "دوا" کے الف کو "کا" بنا کر جملہ بے معنی کر دیا گیا ہے (زیرِ نظر کتاب کا صفحہ ۵۸۹ ملاحظہ ہو) نیز اسی عکس میں لفظ "آپ" کے بعد "کا" کا اضافہ مرتب یا ان کے کسی معاون کا ہے، چونکہ خطوط کی اکثر عکسی نقول کے باب میں میرا اور مرتب کا ماخذ ایک ہے یعنی اقبال اکیڈمی، اس لیے میرا اور مرتب کا عکس ایک ہی ہونا چاہیے۔ میرے پاس مذکورہ خط کی جو عکسی نقل ہے اس میں "کا" نہیں۔ اگلے صفحات میں زیرِ نظر کتاب کے مذکورہ خط کا عکس اور اپنے ذخیرۂ نوادر کے خط کی عکسی نقل دونوں پیش کیے جا رہے ہیں۔

۲۔ تدوینِ متن کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ مکتوب نگار جو لفظ روا روی میں چھوڑ جائے اور وہ سیاقِ کلام کے لیے ضروری ہو، مرتب نقلِ حرفی کرتے وقت اسے

قوسین میں لکھ دے۔ زیرِ نظر کتاب کے مرتب نے اس کا بہت کم اہتمام کیا ہے۔

۳۔ کتاب میں ایک بڑی کمی یہ ہے کہ جن کتابوں سے اقتباس یا حوالے درج کیے گئے ہیں، ان کے صفحات کی سرے سے نشاندہی نہیں کی گئی۔

۴۔ علامہ کے خطوط کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ہر مکتوب نگار کی طرح ان کے بھی بعض محبوب لفظ، جملے یا طرزِ اظہار و املاء تھے۔ مثلاً وہ اپنے خطوط میں "فرمایئے" کو ہمیشہ "فرمائے" لکھتے تھے۔ "غرضیکہ" کو ہمیشہ غرضکہ (اور یہی فصیح ہے) لکھتے تھے۔ "امید ہے" کے بجائے اکثر و بیشتر "امید کہ" (خط کے آخر میں) لکھا کرتے تھے۔ اگر مرتب اس نمایاں خصوصیت کا صحیح ادراک کر لیتے تو کم از کم بعض غلطیوں سے بچا جا سکتا تھا۔

۵۔ بعض حواشی مضحکہ خیز اور گمراہ کن ہیں۔

۶۔ بعض خطوط سراسر جعلی ہیں مگر شاملِ کتاب ہیں۔

۷۔ بعض خطوط کے متین غلط ہیں۔"(۳۳)

ڈاکٹر تحسین فراقی کی تنقیدی ترجیحات میں اگرچہ اقبال شناسی کی پوری روایت بھی ہے اور وہ اس سلسلے میں بعض جائزے لے بھی چکے ہیں لیکن اس روایت کے سلسلے میں جب کوئی اہم اعتقادی دستاویز منظرِ عام پر آئے تو اُس کے انفرادی تجزیے کے ذریعے اُس کے اوصاف کا تعین نیز اُس کے متن پر تحقیق ضرور کرتے ہیں۔ مکاتیب اقبال کے مذکورہ مجموعوں پر اُن کے تجزیات اس سلسلے کے اہم باب ہیں۔ جس میں اُن کی نظرِ تحقیق کی گہرائی اور گیرائی واضح ہے۔

اُن کا یہ تحقیقی حق "مطالب اقبال" (مقبول انور داؤدی)، "بانگ درا کا پہلا مکمل انگریزی ترجمہ" (ڈاکٹر ایم اے کے خلیل) اور "کلیات باقیات شعر اقبال" (ڈاکٹر صابر کلوروی) کے مطالعات میں بھی واضح ہے۔

اول الذکر کتاب دراصل کلامِ اقبال کی فرہنگ و تلمیحات پر مبنی ہے۔ اس سے قبل اس نوع کی قابلِ قدر علمی کاوشیں عابد علی عابد، اکبر حسین قریشی اور تسنیم امروہوی کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے "مطالب اقبال" میں فروگزاشتوں کی ایک علمی نشان دہی کی ہے جن کے باعث کلامِ اقبال کی تفہیم کا درست زاویہ سامنے نہیں آتا۔ اگرچہ بعض فروگزاشتیں بہت معمولی نوعیت کی ہیں یا بعض تفصیلات کی فراہمی کو ضروری نہیں خیال کیا گیا لیکن بعض اغلاط شدت سے لائقِ گرفت ہیں اور متن کی تفہیم کے سلسلے

میں گمراہ کن ہیں۔ اس سلسلے میں الفاظ، تراکیب، اصطلاحات اور علامات کے دیے گئے مفہوم پر ڈاکٹر تحسین فراقی نے جس طرح جامع اسلوب میں گفتگو کی ہے اُس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

> ''ترکِ شیرازی'' کی وضاحت کے طور پر مؤلف نے صفحہ ۲۳ پر لکھا ہے ''شیراز کا محبوب۔ محبوب، معشوق۔ شیراز ایران کا ایک خوبصورت شہر ہے جہاں سعدی اور حافظ ایسے لوگ پیدا ہوئے۔''
>
> حقیقت یہ ہے کہ اس تشریح سے اقبال کے مخصوص مفہوم کی تفہیم میں کوئی مدد نہیں ملتی، کیونکہ اقبال نے یہ ترکیب ''طلوعِ اسلام'' (بانگِ درا) کے درج ذیل شعر میں ایک مخصوص شخصیت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے برتی ہے اور وہ شخصیت عصمت پاشا (یا بصورتِ دیگر بعض کے نزدیک خود کمال اتاترک) کی ہے، جس کی قیادت میں ترکی نے یونانیوں کے خلاف کامیابیاں حاصل کیں اور سمرنا، مشرقی یونان اور ادرنہ پر قبضہ کیا۔ شعر یہ ہے:
>
> ربود آں ترکِ شیرازی دلِ تبریز و کابل را
>
> صبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہم سفر پیدا (۳۳)

اقبال کے مدوّن مجموعہ ہائے کلام کے علاوہ اُن کی شاعری پر عبدالواحد معینی، محمد عبداللہ قریشی اور گیان چند جین نے تحقیق کی اور اس سلسلے میں اپنی کاوشوں کو کتابی صورت بھی دی۔ یہ کاوشیں بعض جزوی مسائل کے باوجود قابلِ قدر ہیں کہ اس طرح اقبال کا باقی ماندہ کلام بھی محفوظ ہو گیا۔

اس سلسلے کا ایک اور جامع کام صابر کلوروی نے کیا جو ''کلیات باقیاتِ شعرِ اقبال'' کے عنوان سے مدوّن ہو کر منظرِ عام پر آیا۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس کے تجزیے میں جہاں اس کاوش کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے اس علمی دستاویز کو سراہا ہے وہاں چند ایسے امور کی جانب بجا طور پر نشان دہی کی ہے جو مدوّن کے لیے نہایت توجہ طلب تھے۔ اس سلسلے میں ایک پہلو تو اس میں بعض ایسی تخلیقاتِ شعر کا شامل ہونا ہے جو اقبال کی نہیں بلکہ دیگر شعرا کی ہیں اور وہ بہت معروف ہیں۔ مثلاً ''مرغِ اسیر کی نصیحت'' اور ''نظمِ معریٰ''۔ اوّل الذکر دراصل مثنوی گلزارِ نسیم کا حصہ ہے جبکہ دوسری حفیظ جالندھری کی نظم بہ عنوان ''فرصت کی تلاش'' ہے۔ دوسری اہم بات کلیات میں بعض ایسے اشعار کا اندراج ہے جو متروک نہیں بلکہ متداول کلام کا حصہ ہیں اور تیسرا اہم نکتہ اُن رسائل و جرائد کے ناموں کا حذف کیا جانا ہے جن میں یہ

منظومات پہلے پہل اشاعت پذیر ہوئیں۔

ظاہر ہے کہ مذکورہ کوتاہیاں ایسی ہیں کہ ان کے لیے ڈاکٹر تحسین فراقی کا انھیں "ہمالیائی نوعیت کی فروگزاشتیں" قرار دینا کچھ غلط معلوم نہیں ہوتا۔

کچھ ایسی ہی ہمالیائی فروگزاشتوں کا ذکر بانگ درا کے اُس انگریزی ترجمے کی بابت بھی کیا گیا ہے جو "Call of the Marching Bell" کے عنوان سے ڈاکٹر ایم اے کے خلیل نے کیا ہے۔

کلام اقبال کئی ایک عالمی زبانوں کے ساتھ ساتھ ہندوپاک کی مقامی زبانوں میں ہو چکا ہے اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ انگریزی زبان میں تراجم کا یہ سلسلہ برطانوی نوآبادیاتی عہد سے شروع ہوتا ہے اور اس کاوش میں نکلسن اور ڈاکٹر ٹی ایچ سورلے شامل ہیں۔ بعد ازاں وکٹر کیرنن اور اے جے آربری ایسے ممتاز اہل دانش نے اپنا حصہ شامل کیا۔

ڈاکٹر ایم اے کے خلیل نے "بانگ درا" کا ترجمہ نثری پیرائے میں کیا اور انگریزی زبان پر عمدہ دسترس کے باعث بلاشبہ عمدہ بھی ہے۔ خصوصاً اقبال کی منظومات میں تراشیدہ تمثالوں کے ترجمے میں مہارت واضح ہے۔ مثلاً نظم "حسن و عشق" کے چند اشعار کا ترجمہ دیکھیے:

جس طرح ڈوبتی ہے کشتی سیمین قمر
نور خورشید کے طوفان میں ہنگام سحر
جیسے ہو جاتا ہے گم نور کا لے کر آنچل
چاندنی رات میں مہتاب کا ہم رنگ کنول
جلوۂ طور میں جیسے ید بیضائے کلیم
موجۂ نکہت گلزار میں □ کی شمیم
ہے ترے سیل محبت میں یونہی دل میرا

Just as the moon's silver boat is drowned
In the storm of sun's light at the break of dawn
Just as the moon-like lotus disappears
Behind the veil of light in the moon-lit night
Just like the Kalim's radiant palm in the Tur's effulgence
And the flower-buds' fragrance in the wave of garden's breeze
Similar is my heart in the flood of thy love.[35]

ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس نوع کے عمدہ اور دلکش تراجم کو بہ نگاہِ تحسین دیکھا ہے لیکن بعض اصطلاحات و تلمیحات کے ترجمے نیز شخصیات کے تعین کے سلسلے میں مترجم سے جو کوتاہیاں ہوئی ہیں اُن کی بجا طور پر نشان دہی مگر نہایت محتاط الفاظ میں گرفت کی ہے۔ مذکورہ اصطلاحات اور تلمیحات کی نوعیت کو دیکھا جائے تو اقبال کی فرہنگ مرتب کرنے والوں کے ہاں بھی ایسی اغلاط نمایاں نظر آتی ہیں اور شروح رقم کرنے والوں کے ہاں بھی کہیں کہیں یہ صورت مضحکہ پیدا ہوتی ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے جن اغلاط کی نشان دہی کی ہے، اُن میں سے چند مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں۔ ان سے اغلاط کی نوعیت اور گرفت کا اسلوب بھی واضح ہو سکے گا۔

(۱) عدم کو قافلۂ روز تیز گام چلا
شفق نہیں ہے یہ سورج کے پھول ہیں گویا

مترجم نے "سورج کے پھول" کا ترجمہ "Sun's Flower" کر دیا۔ حالانکہ یہاں پھول "فلاور" کے معنی میں نہیں بلکہ چتا کی راکھ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اور اسی سے "عدم" کے ساتھ اس کی مناسبت پیدا ہوئی ہے۔

(۲) الٰہی عقلِ خجستہ پے کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے
اسے ہے سودائے بخیہ کاری، مجھے سرِ پیرہن نہیں ہے

O' God! teach a love to my happy intellect

It loves fine stictching but my shirt has no collar

اس ترجمے میں "عقلِ خجستہ پے" کا ترجمہ "Happy Intellect" غلط محض ہے اور "سرِ پیرہن" کا ترجمہ "My shirt has no collar" مضحکہ خیز ہے۔
کون نہیں جانتا کہ یہاں "سر" خیال کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

(۳) رخت جاں بتکدۂ چیں سے اٹھا لیں اپنا
سب کو محوِ رخِ سعدیٰ و سلیمیٰ کر دیں
(بانگِ درا، ص۱۴۳)

مترجم نے پہلے مصرعے کی "سعدیٰ" کو "سعدی" پڑھا اور ترجمے میں نہ صرف سعدی لکھا بلکہ سعدی شیرازی پر ایک مفصل سوانحی نوٹ بھی لکھ ڈالا۔ انھیں یہ نہیں

معلوم کہ سلیمیٰ، (ع) سعاد اور دیگر محبوبان عرب کے ساتھ ساتھ سعدیٰ کا نام بھی عربی شاعری میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ کامل المبرد میں سے ذیل کا شعر دیکھیے:

وکنت اذا ما زرت سعدیٰ بارضھا
اریٰ الارض تطویٰ لی و یدنوا بعیدھا

یعنی جب کبھی میں سعدیٰ سے ملنے اس کی سرزمین میں جاتا تھا تو مجھے محسوس ہوتا تھا کہ زمین میرے لیے لپٹتی جا رہی ہے اور اس کا دور کا حصہ قریب آتا جا رہا ہے۔

یک نظر کردی و آداب فنا آموختی
اے خنک روزے کہ خاشاک مرا واسوختی

(بانگ درا ص ۱۲۷)

مترجم نے "اے خنک روزے" کا ترجمہ "How cool the day" کیا ہے۔ حالانکہ خنک کا لفظ یہاں خوش یا اچھا کے معنوں میں آیا ہے۔ فارسی میں ناز خنک، ادائے خنک، گفتار خنک اور خواب خنک وغیرہ انھی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔"(۳۶)

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا ہے کہ ڈاکٹر تحسین فراقی کی نظر اقبال شناسی کی روایت پر بھی ہے اور اس روایت کے بارے میں اُن کی مجموعی رائے بھی نقل کی جا چکی ہے۔ یہ واضح ہو کہ اُن کی مذکورہ رائے کسی سرسری جائزے کا نتیجہ نہیں بلکہ اُن کے بعض مستقل اور مفصل مضامین ہیں۔ ان مضامین میں انھوں نے قومی اور بین الاقوامی سطح پر اقبال پر رقم کی جانے والی تنقید کا جائزہ لیا ہے۔ یہ الگ بات کہ وہ اپنے جائزوں سے کوئی خوش کن نتیجہ برآمد نہ کر سکے اور اس اعتراف کے باوجود کہ "اُن (اقبال) کی زلفِ کمال کے اسیر صرف اپنے ہی نہیں بیگانے بھی اتنی ہی چاہت اور شدت سے ہوئے" یہی یاس انگیز مصرع ہی ادا کیا کہ "نہ اپنے ان کی کامل تحسین کر سکے نہ پرائے۔"

کاملیت کی آرزو کرنا یقیناً مستحسن ہے لیکن بعض کوتاہیوں کی بنیاد پر یاس انگیزی کوئی خوش کن تاثر قائم نہیں کرتی۔

"جلوہ خوں گشتہ و نگاہے بہ تماشا نرسید" اور "ایران میں اقبال شناسی کے دس سال" ایسے مضامین ہیں جن میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے ہندوستان، جرمنی، اٹلی اور ایران میں اقبال شناسی کے مختلف زاویوں کا

جامع جائزہ لیا ہے۔ ان تجزیات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ عالمی سطح پر اقبال شناسی کے سلسلے میں ہونے والے علمی کاموں پر اُن کی نظر کس قدر گہری ہے۔

اوّل الذکر مضمون میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے جن اہلِ نقد کی کتب پر بطورِ خاص توجہ کی ہے، اُن میں درج ذیل قابلِ ذکر ہیں:

i۔ اقبال ــــ ایک مطالعہ (کلیم الدین احمد)

ii۔ Iqbal's Concept of God (ڈاکٹر سلمان رشید)

iii۔ خطباتِ اقبال پر ایک نظر (مولانا سعید احمد اکبرآبادی)

iv۔ اقبال (مجنوں گورکھپوری)

مذکورہ کتب کے علاوہ ایرانی صاحبانِ دانش ڈاکٹر لطف علی صورت گر، ڈاکٹر علی شریعتی اور سید حسین نصر کی اقبالیات کے سلسلے میں افکار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس مضمون میں جن مستشرقین کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے، اُن میں برطانوی اہلِ قلم نکلسن اور الفریڈ گیوم، جرمن مستشرقین جے ڈبلیو فوک اور این میری شمل اور اطالوی مفکر بوزانی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ روسی اسکالرز کے مقالات کے مجموعہ "The Work of Muhammad Iqbal" (مرتب: عبدالرؤف ملک) کا تعارف بھی کرایا گیا ہے۔

اس مضمون میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے کلیم الدین احمد کے اعتراضات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ تاہم اُن کا جواب مختصراً دیا ہے اور تفصیل کے لیے عبدالمغنی کی کتاب "اقبال اور عالمی ادب" کی طرف رجوع کرنے کو مناسب خیال کیا ہے۔ سلمان رشید کی کتاب کے بارے میں اُن کا نقطۂ نظر ہے کہ یہ محض خطباتِ اقبال کے محدود مطالعے پر مبنی ہے۔

ترقی پسند تنقید کا یہ المیہ ہے کہ وہ ایک طرف اقبال کو فاشسٹ قرار دیتے ہیں جبکہ دوسری طرف بعض منظومات کی بنیاد پر انھیں اپنا ہمنوا خیال کرتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری کی کتاب "اقبال" کے تناظر میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے بیشتر ترقی پسند ناقدین کے اقبال پر اعتراضات کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ تحقیق کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ اقبال نہ تو فاشسٹ تھے نہ اشتراکیت پسند بلکہ اُن کی شاعری کا سرچشمہ قرآن، حدیث اور تصوف ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے ایران میں اقبال شناسی کے عمل پر اپنے اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ خصوصاً اہلِ ایران کا انھیں "مجددِ ادبیات" قرار دینا اور اُن کے اسلوب کو "سبکِ اقبال" کہنا اُن کے نزدیک

اقبال کی عظمت کا بڑا اعتراف ہے۔

اس مضمون میں مستشرقین کی اقبال شناسی پر مختصراً اظہار خیال کیا گیا ہے۔ شاید ایک مضمون میں اس قدر نکات کو سمیٹنا ممکن نہیں تھا۔ یا اُن کے لاشعور میں اقبال کا یہ موقف تھا کہ "مستشرقین کے مقاصد غالب طور پر سامراجی ہوتے ہیں اور علمی کم۔" بہر حال انھوں نے این مری شمل کے بعض خیالات پر چند تحسینی جملے ضرور رقم کیے ہیں۔

مجموعی طور پر یہ مضمون اپنے باطن میں ایک درد مندی کا پہلو رکھتا ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی بعض تنقیدی رویوں پر حرف افسوس رقم کرتے ہوئے بہ دلائل اُن کی تردید ہی نہیں کرتے بلکہ اصل حقائق سے بھی پردہ اُٹھاتے ہیں اور نقش تاریک کے مقابل عکس روشن عیاں کرتے ہیں۔ "ایران میں اقبال شناسی کے دس سال" جامع تجزیے مگر نہایت سرشاری کے ساتھ رقم کیا گیا مضمون ہے۔ جس میں ایرانی اہل نقد کی کتب اور اہم مضامین کے علاوہ وسندی تحقیق پر مبنی مقالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ایران میں وسیع پیمانے پر اقبالیاتی تحقیق کی روشنی میں وہ یہ تجویز پیش کرتے ہیں:

> "اقبال کے باب میں ایران میں مسلسل کام ہو رہا ہے۔ جناب آیت اللہ خامنہ ای نے اپنے معروف خطاب میں فرمایا تھا: "بہر حال امیدوارم کہ ما جوانان حق اقبال را بشناسیم و جوانان تاخیری را کہ ملت ما در طول این چہل و پنجاہ سال اخیر در شناخت اقبال داشتہ است، جبران کنیم"۔ "اقبال ستارۂ بلند شرق" (اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۹۳ء) ص ۶۲۔ میرے خیال میں تلافی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ تہران جیسے شہر علم میں ایک وسیع و عریض اقبال مرکز قائم کیا جائے جس کے ساتھ ایک عمدہ لائبریری اپنی تمام تر سہولتوں کے ساتھ موجود ہو۔ علاوہ ازیں ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں "اقبال مسندیں" قائم کی جائیں۔ ایران اور پاکستان کے مابین اسلام کے بعد سب سے زندہ، روشن، امید افزا اور ضامن بقا رابطہ اقبال کے ذریعے قائم ہو سکتا ہے۔ وہی اقبال جس نے مدتوں پہلے کہا تھا اور کس قدر درست کہا تھا:
>
> مدد از دست و دامانم کہ یابی
> کلید باغ را در آشیانم؟"(۲۶)

اقبال کے کلام کی فکری سطح بلاشبہ ارفع ہے لیکن فنی طور پر بھی اُن کی شاعری اپنے باطن میں کمالات کے کئی ایک پہلو رکھتی ہے۔ ماہرینِ اقبال نے اوّل الذکر صفت پر تو بہت توجہ کی ہے لیکن اُن کے فن کی کما حقہ تعریف و توصیف کم ہی کی جا سکی ہے۔ بعض ناقدین نے اس طرف مناسب توجہ کرتے ہوئے بعض کاوشیں ضرور کی ہیں لیکن اُن کی مقدار نہایت کم ہے۔

"اقبال کی اُردو شاعری کا مختصر فنی جائزہ" میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے اقبال فہمی کی کمی میں اس نقطہ نظر پر بھی لکھا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جہاں اُن کا یہ شکوہ اُردو تنقید سے ہے، یہ الزام خود اُن پر بھی آتا ہے۔ خصوصاً اس حوالے سے یہ نکتہ زیادہ اہم ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر تحسین فراقی کلاسیکل شاعری اور اس کے اسالیب پر کمال دسترس رکھتے ہیں اور لفظ کا شعری شعور اُن کی تحریروں میں جھلکتا ہے۔ انھوں نے اقبال کی شاعری کا فنی جائزہ محض ایک مضمون میں لیا ہے اور وہ بھی اپنے باطن میں صلب اجمال کا حامل ہے۔

اس مضمون میں انھوں نے اقبال کی خود نوشت بیاضوں کی روشنی میں یہ امر واضح کیا ہے کہ وہ اپنے مصرعوں کو صیقل کرنے کے لیے کس قدر ریاضت سے کام لیا کرتے تھے۔ اپنے اس مضمون میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے اقبال کے ہاں لفظ کے شعور، تراکیب کے ہنر، تلمیحات کی وسعت، صوتیات کے احساس، نظامِ قوافی کے جمال اور تضمینات کے سلیقے پر اجمالاً مگر جامعیت کے ساتھ لکھا ہے اور بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

> "اقبال کا شعری سرمایہ بحیثیت مجموعی اس امر کی قوی برہان مہیا کرتا ہے کہ انھوں نے اس میں اپنی فکر ہی کے تئیں اپنے فن کے بھی حیران کن کمالات دکھائے ہیں۔ کیٹس نے کہا تھا کہ شاعر سے زیادہ غیر شاعرانہ شخصیت کسی کی نہیں ہوتی۔ اس سے اس کی مراد ہم احساسی یعنی Empathy تھی۔ اقبال کے شعری عمل میں اس ہم احساسی اور متصورہ اور متخیلہ دونوں کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ان کا متصورہ انھیں مشاہدۂ عمیق کے نتیجے میں جو تمثالیں فراہم کرتا تھا، وہ متخیلہ کے زور سے انھیں ایک وحدت میں، ایک کل میں ڈھال دیتے تھے۔" (۲۸)

ڈاکٹر تحسین فراقی کی اقبال شناسی کی مذکورہ کاوشیں بلاشبہ علمی وسعت کی حامل نظر آتی ہیں۔ اُن کی تحقیق و تنقید کا مرکز اقبال کی شخصیت اور فکر و فن کے حوالے سے ایک نہیں کئی ایک ہیں۔ انھوں نے اقبال کی شاعری کے بھی فکری پہلوؤں پر توجہ کی اور اُن کی نثر کی فلسفیانہ اساس پر حکمت انگیز نکات اٹھائے۔ اُن کی یہ

کاوشیں اقبال شناسی کے اُس سارے عمل کا حصہ ہیں جو ہند و پاک کے علاوہ دنیا بھر میں ایک خاص توازن کے ساتھ جاری ہے اور ڈاکٹر تحسین فراقی جہاں اقبال کے فکر و فن پر اپنی ذاتی فکری بے تابی رقم کرتے ہیں وہاں اقبال شناسی کے مذکورہ عالمی منظر نامے پر بھی نظر کرتے ہوئے اپنا زاویہ نظر بیان کرتے ہیں۔

وہ اقبال کو محض اُردو ہی کا نہیں عالمی سطح کا شاعر اور مفکر خیال کرتے ہیں جن کے افکار عالمی تمدن کی تبدیلی کے عمل میں واضح نظر آتے ہیں۔ اُن کے نزدیک اقبال صرف نوآبادیاتی دور کے آقاؤں کے ناقد نہیں بلکہ اُن کی نظر مستقبل کے نقشے پر بھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شاعری کے امامِ اعظم ہیں۔

اقبال شناسی کے عالمی و قومی سطح کے پورے عمل پر اُن کی آغاز تا حال نظر ہے اور وہ اس کے محاسن و معائب پر بغیر کسی لگی لپٹی کے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

"نقدِ اقبال۔ حیاتِ اقبال" میں اُن کی ایک عمدہ تحقیقی دستاویز ہے جس میں اُن نایاب و نادر مضامین کو یکجا کیا گیا ہے جو اقبال کی زندگی میں اُن کی فکر اور فن پر لکھے گئے۔ یہ تحریریں اس امر کی گواہ ہیں کہ اقبال کو اُن کی فکری رفعت اور ملی استقامت کی بنیاد پر بہت ابتدا ہی میں اہلِ نقد نے اہمیت دینا شروع کر دی تھی۔

اس کتاب میں شامل مضامین ۱۹۰۵ء سے ۱۹۳۶ء تک لکھے گئے ہیں اور مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔ یہ رسائل نایاب ہیں اور مضامین بھی نادر۔ اس اعتبار سے ان کی دریافت اور یکجائی کے ساتھ اشاعت اقبال شناسی کی ابتدائی روایت کی تفہیم کے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اقبال کی نظم و نثر کے بارے میں اُن کے معاصرین کا فکری زاویہ جاننے کے لیے یہ کتاب تاریخی حیثیت کی حامل ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر تحسین فراقی کا یہ نقطۂ نظر قرینِ حقیقت ہے کہ:

> "یہ مبالغہ نہیں امرِ واقعہ ہے کہ بیسویں صدی کے اوائل سے ان کی وفات (اپریل ۱۹۳۸ء) تک ان کی فکر و فن پر سیکڑوں مضامین لکھے گئے۔ یہ تعریفی و توصیفی بھی تھے اور تنقیدی و تنقیصی بھی۔ ان میں سے بعض میں گہرے ادبی و تنقیدی شعور اور تحلیل و تجزیے کی شان بھی تھی اور بعض محض چلتے ہوئے، سرسری اور خا[illegible] تشریحی نوعیت کے بھی تھے۔ تھوڑے سے معیاری فرق کے ساتھ یہ صورتِ حال آج بھی جاری ہے۔
>
> علامہ کی وفات پر آج نصف صدی کا عرصہ بیت چکا۔ میرے خیال میں کسی بھی اہم شخصیت کے معروضی مطالعے کے لیے پچاس سال کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا۔

س دوران میں عالمی سطح پر اور خود ہمارے یہاں بھی بعض نئے تنقیدی اور تحلیلی
منہاج پیدا ہوئے ہیں ان کی روشنی میں اقبال اور کلامِ اقبال کے تجزیے اور
محاکے کی ضرورت ہے۔ اس محاکے کے لیے علامہ پر لکھی گئی وہ تحریریں بھی قابلِ
توجہ ہیں جو اقبال کے دورانِ حیات میں وجود میں آئیں۔ ایک اعتبار سے دیکھا
جائے تو اقبال اور ان کے کلام پر ان کی حیات میں لکھی جانے والی تحریروں کو
محفوظ کرنا اشد ضروری ہے۔ ان سے بعض ایسے حقائق سامنے لانے میں مدد مل
سکتی ہے جو ان تحریروں کے غیر مدون ہونے کی وجہ سے وقت کی گرد میں دب
گئے ہیں۔ یہ درست ہے کہ معاصرت بعض صورتوں میں حجاب بن جاتی ہے اور
اقبال کے باب میں بھی ایسا ہوا لیکن ایسا بھی نہیں کہ معروضیت بالکل مفقود اور
معطل رہی ہو۔ چنانچہ حق گوئی اور تنگ نظری، تعصب اور وسعتِ نظر، آفاقیت
اور مقامیت، ان سب کے مظاہر اقبال پر ان کی حیات میں لکھے گئے مضامین و
مقالات میں دیکھے جا سکتے ہیں۔" (۳۹)

"نقدِ اقبال۔ جہاتِ اقبال میں" میں شامل مندرجات کی اہمیت بلاشبہ ہے لیکن تدوین کے لحاظ
سے ایک تشنگی یہ محسوس ہوتی ہے کہ ان مضامین کے مصنفین کے سلسلے میں کوئی تعارفی نوٹ نہیں دیا گیا۔
یہ نقطہ اس لیے اہم ہے کہ مصنفین میں چند نام مثلاً سید نذیر نیازی، سجاد حسن اور یوسف سلیم چشتی وغیرہ
کے ناموں سے اہلِ اردو ادب کی شناسائی موجود ہے لیکن بیشتر نام جیسے دیا نرائن نگم، کرشن بھولا ناتھ، میر
سعادت علی خاں اور نواب سلطان جہاں بیگم ایسے نام قطعی غیر معروف ہیں اور ضروری تھا کہ ان کے
بارے میں کوئی آگاہی فراہم کی جاتی۔ اس طرح ایک مضمون کا مصنف نامعلوم ہے اور بطور مصنف
"ایک اعتدال پسند ہندو" درج ہے تو بہت ضروری تھا کہ موصوف کے بارے میں تحقیق کر کے کوئی
وضاحتی نوٹ رقم کیا جاتا۔

اقبال کی شاعری کے فکری عناصر کے ساتھ ساتھ اُن کے خطبات پر بھی ڈاکٹر تحسین فراقی نے
قابلِ قدر تنقیدی کاوشیں کی ہیں۔ اگرچہ اس سلسلے میں انھوں نے جملہ خطبات کو موضوع نہیں بنایا بلکہ بعض
چیدہ افکار کی روشنی میں منتخب خطبات پر اپنی رائے دی ہے۔ اس سلسلے میں وہ اقبال کے مداح بھی ہیں لیکن
بعض افکار کے معروضی پہلوؤں اور عملی صورت کو سامنے رکھتے ہوئے الگ زاویۂ نظر سے بھی دیکھتے ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کی اقبال شناسی کا ایک بڑا زاویہ اُن کی بعض تحقیقی کاوشیں ہیں۔ "مطالعہ بیدل ـــ فکر برگساں کی روشنی میں" کی دریافت، ترجمہ اور تدوین اُن کے بڑے کارناموں میں سے ہے۔ یہ یقیناً ایک نہایت اہم فکری کاوش ہے جو اقبال کے قلم سے نکلی مگر پردۂ اخفا میں تھی۔ اس کی تدوین اور ترجمہ سے علمی دنیا جہاں اقبال کی اس نایاب علمی و فلسفیانہ تحریر سے آگاہ ہوئی، وہاں خود اقبال کی فکر کے بعض پہلوؤں تک تنقیدی بصیرت سے آگاہی بھی ہوئی۔ "مطالعہ بیدل ـــ فکر برگساں کی روشنی میں" کے علاوہ بھی آپ اقبال کی بعض نادر و نایاب تحریروں کا سراغ لگا کر انھیں منصۂ شہود پر لائے ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کی عمیق نگاہی کا اندازہ اُن تجزیات سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے مختلف کتب کے بارے میں رقم کیے۔ یہ کتب جو بذات خود تحقیق کا ثمر ہیں مگر محققین و مدوّنین نے جن اہم پہلوؤں سے صرفِ نظر کیا اور ڈاکٹر تحسین فراقی نے اُن فروگزاشتوں پر جس طرح گرفت کی، اُس سے یہ نکتہ اچھی طرح مترشح ہو جاتا ہے کہ وہ کوئی تجزیہ رقم کرتے ہوئے کس قدر تحقیقی بصیرت سے کام لیتے ہیں۔

اقبال شناسی کی روایت کے مجموعی جائزے یا کسی انفرادی کاوش کا تجزیہ کرتے ہوئے اُن کے لہجے میں بعض مقامات پر تلخی و طنز کا عنصر بھی ابھرتا ہے اور ممکن ہے کہ اس سے کچھ رنجیدہ خاطری بھی ہوتی ہو لیکن اس نوع کی صورت حال کا ازالہ وہ علمی بصیرت اور دلائل کے قرینے سے کر لیتے ہیں یوں اُن کی تنقید کی نشتریت علمی و فکری فضا کی صحت کے اسباب بہم پہنچاتی ہے۔

(۲)

اُردو شعر و ادب کی آبیاری میں کئی ایک تخلیقی شخصیات نے اپنا تہذیبی کردار ادا کیا ہے اور بلاشبہ ہر کردار اپنی نوع اور کیفیت کے لحاظ سے اہم ہے لیکن ڈاکٹر تحسین فراقی کے نزدیک جو دو شخصیات مرکزی حیثیت کی حامل ہیں، وہ غالب اور اقبال ہیں۔ یہ ایسی شخصیات ہیں جنھیں اُن کی ہمہ جہت فکری اساس کی بنیاد پر وہ انھیں اُردو شاعری کے اسمِ اعظم بھی قرار دیتے ہیں۔ دلچسپ امر ہے کہ غالب ہندوستان میں برطانوی نوآبادیات کے نقطۂ آغاز پر کھڑے ہیں جبکہ اقبال اُس کے نقطۂ انجام پر۔ دونوں اہلِ قلم نے تہذیبی کشمکش کے دور پُر ہنگام میں اپنا اپنا ثقافتی کردار ادا کیا۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے غالب پر باقاعدہ طور پر صرف ایک کتاب "غالب۔ فکر و فرہنگ" کے عنوان سے رقم کی ہے لیکن چند دیگر مضامین کے علاوہ "دیوانِ غالب (نسخۂ خواجہ) اصل حقائق" بھی

نہایت اہم تحقیقی دستاویز ہے۔

اُردو شاعری کے امامِ اعظم کے بارے میں اُن کے خیالات کا ذکر بالتفصیل آگے کیا جائے گا لیکن ان کو اجمال میں دیکھنا ہو تو درج ذیل جملے کافی ہیں:

> "غالب ہمارے لیے محض ایک شاعر نہیں بلکہ ایک تہذیب اور ایک تاریخ ہیں۔ ایسے شاعر، جن کے کلام میں ہند ایرانی تہذیب کے بہترین عناصر جلوہ افروز ہیں، ایک ایسے شاعر جو نفسِ انسانی کی رنگا رنگی اور گہرے تموجات کی دھنک مرتب کرتے ہیں، وہ روحِ انسانی کے سچے نباض ہیں اور بیکرانی کے پس منظر میں بڑے بڑے سوال اٹھاتے ہیں۔"(۲۰)

کسی بھی موضوع پر لکھتے ہوئے اُس کے جامع پس منظر کی تفہیم ضروری ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر تحسین فراقی کی تنقید کا جائزہ لیا جائے تو اُردو شاعری کے اسمِ اعظم پر حرفِ نقد رقم کرتے ہوئے اُن کا یہ سلیقہ واضح نظر آتا ہے۔ اگرچہ اقبال پر تنقید کا جائزہ انھوں نے بہت مفصل اور متنوع جہتوں سے لیا ہے اور غالب پر تنقیدی تناظر کو اسی وسعت کے ساتھ نہیں دیکھا لیکن اپنے اختصار میں جامعیت کو ضرور مدِ نظر رکھا ہے۔

غالب شناسی کے سلسلے میں اُن کی دو کاوشیں لائقِ ذکر ہیں۔ ایک "اُردو تنقید کے دس سال" کے عنوان سے مضمون کا وہ جزو جو غالب پر لکھی گئی کتب سے متعلق ہے اور دوسرا مضمون "پاکستان میں غالب شناسی ــــ اجمالی جائزہ اور تجاویز" کے زیرِ عنوان رقم کیا گیا ہے۔

اُردو میں غالب شناسی کے بارے میں اُن کا نقطۂ نظر معلوم کیا جائے تو ایک خاص پہلو یہ بھی سامنے آتا ہے کہ ڈاکٹر تحسین فراقی خود غالب کو کس طرح دریافت کرنا چاہتے ہیں اور اس لحاظ سے وہ غالب شناسوں کے ہاں کیا تشنگی محسوس کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> "ہمارے غالب شناسوں نے غالب کی اُردو تصانیف پر تو قلم اٹھایا ہے اور بعض صورتوں میں تحقیق و تجزیہ کا حق بھی ادا کیا ہے مگر غالب کی فارسی نظم و نثر کے اس ذخیرے سے بہت کم اعتنا کیا ہے جو مقدار میں ان کے اُردو سرمایے سے کہیں زیادہ ہے اور معیار میں اس سے کسی صورت کم نہیں بلکہ بعض جہتوں سے بمراتب آگے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کیا غزل، کیا قصیدہ اور کیا مثنوی، غالب نے ان اصناف

میں اپنی قابلِ رشک انفرادیت کا علم بلند کیا ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ چونکہ فارسی
زبان و ادب سے ہمارا رشتہ ایک صدی سے زیادہ عرصہ ہونے کو آیا، کٹ چکا ہے،
ہمارے ہاتھ سے وہ کلید گم ہو گئی ہے جو فارسی ادبیات کے سلسلہ در سلسلہ پھیلے رفیع
الشان محلات تک ہماری باریابی کا ذریعہ ہو سکتی تھی۔"(۴۶)

"میرے خیال میں غالب کی شخصیت اور فن کے تمام مطالعات خواہ وہ کتنی محنت
اور اخلاص سے لکھے گئے ہوں، اس وقت تک ادھورے اور یک رخے رہیں گے
جب تک غالب کا ان کی کلیت میں مطالعہ نہیں کیا جاتا۔ ان کے فارسی شعری اور
نثری کارنامے ان کی شخصیت کے بعض ایسے پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتے ہیں
جو بالعموم نظروں سے اوجھل ہیں۔"(۴۷)

اُردو میں غالب شناسی کے عمل کے بارے میں مذکورہ ارشادات کی روشنی میں ڈاکٹر تحسین فراقی کے رجحاناتِ نقد کو دیکھا جائے تو آپ نے اپنی زیادہ تر توجہ غالب کی فارسی تخلیقات پر صرف کرتے ہوئے اُردو تنقید کے اُس معروف بیانیے کے رد کی کوشش کی ہے جس کے مطابق غالب ایک مذہب بیزار اور دین گریز فرد تھے۔

"غالب ـــ فکر و فرہنگ" کے تجزیے سے قبل ایک اجمالی نظر "اُردو تنقید کے دس سال" کے عنوان سے مضمون کے اُس جزو پر بھی ڈال لینی چاہیے جو غالب سے متعلق بعض تصانیف کے تجزیے پر مشتمل ہے جو درج ذیل ہیں:

i۔ غالب کی تہذیبی شخصیت (جیلانی کامران)
ii۔ غالب کون؟ (سلیم احمد)
iii۔ نذرِ غالب (ڈاکٹر وحید قریشی)
iv۔ غالب ـــ شاعرِ امروز و فردا (ڈاکٹر فرمان فتح پوری)
v۔ غالب اور انقلابِ ستاون (سید معین الرحمٰن)
vi۔ غالب ـــ شخص اور شاعر (مجنوں گورکھپوری)

مذکورہ کتب کے تجزیات ایک مضمون کا جزو ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے کہ تفصیل سے رقم کیے جانے ممکن نہ تھے اور نہ ہی ان کتب کے مندرجات کو اُس زاویۂ نگہ سے دیکھا گیا ہے جو ڈاکٹر تحسین فراقی کا

اختیار نقد ہے۔ ان تجزیات میں اُس مرکزی نکتے پر بات کی گئی ہے جو منشائے مصنف ہے یا ایسے قابل لحاظ پہلو جن سے بحث کا کوئی دروازہ کھلتا ہو۔

جیلانی کامران نے غالب کو مومن و ذوق کا ہم عصر قرار دینے کے بجائے علاقائی زبانوں کے شعرا کا معاصر قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی یہ سوال اُٹھاتے ہیں:

> "جیلانی صاحب کے نزدیک فکری اعتبار سے غالب کے ہم عصر، مومن اور ذوق نہیں بلکہ وہ شاعر ہیں جو اس زمانے میں علاقائی زبانوں کے ذریعے اپنی واردات بیان کر رہے تھے، مومن کی مثنوی جہادیہ تو خیر ایک طرف، خود ذوق کے یہاں کلاسیکی علوم اور اُن کی روح (خصوصاً قصائد میں) جس اعتبار سے جلوہ گر ہوئی ہے کیا وہ غالب کو ذوق کی ہم عصریت عطا نہیں کرتی۔" (۴۳)

سلیم احمد کی کتاب "غالب کون" نفسیاتی زاویے سے بہت اہم کاوش ہے لیکن اس کے مباحث اپنے باطن میں بہت پیچیدگی رکھتے ہیں۔ اس کتاب کے جائزے میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے کسی گہرائی میں جانا مناسب خیال نہیں کیا اور محض ایک دو اقتباسات ہی رقم کرنے پر اکتفا کیا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی کتاب "نذرِ غالب" میں اُن کی توجہ کا مرکز دو مضامین "غالب اور اس کا ماحول" اور "غالب کا نظریۂ شعر" بنے ہیں۔ ان مضامین کی پسندیدگی کی وجہ یہ بھی ہے کہ ان میں غالب کو ایسے ہندی اور فارسی شعرا کے افکار و اثرات کے تناظر میں دیکھا گیا ہے جن کی شاعری میں روحانی ارتقا اور حیرت کی فراوانی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے غالب پر نفسیاتی حوالے سے بھی گفتگو کی ہے اور غالب کے مقطعوں پر بھی بات کی ہے۔ اس کے علاوہ غالب کا اسلوبِ طنز بھی اُن کا موضوع رہا ہے۔ موخرالذکر مضمون کے سلسلے میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے یہ نکتہ واضح کیا ہے کہ "ظرافت اور طنز دونوں کا مقصد اصلاحی ہے۔ ایک کا طریق کار خوش مزاج طبیب کا ہے اور دوسرے کا نشتر بدست جراح کا۔ دونوں کا مقصد صحت فکری و روحانی ہے۔"

"غالب اور انقلاب ستاون" میں شامل مضمون "انقلاب ستاون اور غالب کا شعری رویہ" میں طرزِ تحقیق کو ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس اعتبار سے سراہا ہے کہ اس میں جنگ آزادی سے منسوب غالب کے بیسیوں اشعار کا اصل زمانی زاویہ دکھایا گیا ہے اور حقائق کو واضح کیا گیا ہے۔

ترقی پسند نقاد مجنوں گورکھپوری کی کتاب "غالب — شخص اور شاعر" پر تنقید میں تجزیہ قدرے کم

اور طنز کا رنگ زیادہ ہے۔ انھوں نے ابتدا ہی اس جملے سے کی ہے کہ

> ''کسی نقاد نے مجنوں صاحب کی تنقید کے بارے میں کہا تھا کہ وہ اتنی دھان
> پان ہوتی ہے کہ پھونک مارے اڑ جاتی ہے یقین نہ آئے تو ان کی تازہ ترین
> کتاب ''غالب ــــ شخص اور شاعر'' ملاحظہ کر لیجیے۔''(۳۳)

''پاکستان میں غالب شناسی'' ایک اجمالی نوعیت کا مضمون ہے جس میں کتب و مضامین کی نہ تو کوئی تفصیل مہیا کی گئی، نہ ہی اُن کے عمیق جائزے لیے گئے ہیں۔ ۱۸۲۱ء میں غالب پر لکھی گئی پہلی تحریر بعنوان ''اسد اللہ اسد'' (اعظم الدولہ) اور پہلی باقاعدہ تصنیف یادگارِ غالب (الطاف حسین حالی) سے لے کر تا حال ہند و پاک میں تصنیف کی جانے والی بعض کتب اور کچھ اہم مقالات کا ذکر نیز اجمالی تجزیہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے ایک خاص المیے کی جانب توجہ مبذول کراتے ہوئے ایک اہم تہذیبی سوال رقم کیا ہے۔ وہ غالب شناسی کی ماضی کی روایت کے تو مداح ہیں اور بعض معاصر اہلِ نظر کے حوالے سے بھی اطمینان بخش احساسات کا اظہار کرتے ہیں لیکن ہند و پاک میں فارسی زبان کے زوال کی روشنی میں یہ حرفِ افسوس و استفہام رقم کرتے ہیں:

> ''موجودہ غالب دوستوں میں کتنے ہیں جو فارسی زبان و ادب سے واقف اور
> اس کی باریک تر نکتوں سے آگاہ ہیں۔ حالی نے ''یادگارِ غالب'' میں آج
> سے ایک سو پندرہ برس پہلے فارسی سے عام اجنبیت کی جس صورتِ حال کا
> ذکر کیا تھا، وہ آج ایک خوف ناک المیے کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ اگر ملک
> میں انگریزی زبان کی استعماری یلغار کا یہی عالم رہا تو ہم غالب جیسے بے
> مثل شاعر کے حکیمانہ کلام سے استفادہ کرنے اور اسے انھیں تجانی بنانے
> سے قاصر رہ جائیں گے۔''(۳۴)

اس مضمون کا اختتام اس تجویز پر کیا گیا ہے کہ غالب کے کلام، اُن کے افکار نیز اسالیب کی درست تفہیم کے لیے فارسی کا چلن عام کیا جائے۔ یہی وہ راستہ ہے جس کے ذریعے شاعری کے اس امامِ اعظم کو کلی حیثیت میں سمجھا جا سکتا ہے۔ اپنی اس تجویز کی روشنی میں وہ اہلِ علم و ادب کے سامنے یہ سوال بھی رکھتے ہیں کہ موجودہ تہذیبی منظر نامہ کیا اس قابل ہے کہ فکرِ غالب کا کما حقہ ادراک کر سکے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''عام آدمیوں کی اس صدی میں جب The Cult of Ordinary Chap

کا ہر چہار جانب شور مچا ہوا ہو، کچھ لوگ ـــــ گلشن نا آفریدہ کے عنادل ـــــ ضرور موجود رہنے چاہئیں جو ہمیں عشق و آگہی اور فکر و فرہنگ کے معانی سمجھا سکیں۔ غالب بالیدہ شعور کے حامل ایک ایسے ہی مردِ آگاہ تھے۔ کیا ہمارا موجودہ تہذیبی منظر نامہ غالب کے بلند اور بالیدہ افکار کا متحمل ہو سکتا ہے؟ یہ آج کے تناظر کا ایک اہم سوال ہے۔"(۳۰)

یہی وہ تہذیبی سوال ہے جو ڈاکٹر تحسین فراقی کی غالب شناسی کی بنیاد ہے۔ انھوں نے غالب کی فکر و فرہنگ کے تعین کے سلسلے میں جو تنقیدی کاوشیں کی ہیں اُن میں سے بیشتر بلکہ تقریباً کل کا تعلق فارسی نظم و نثر سے ہے۔ "غالب ـــ فکر و فرہنگ" ۸ مضامین پر مشتمل کتاب ہے جس میں غالب کے فارسی خطوط بعنوان "پنج آہنگ" "شاہانِ تیموری کی نامکمل تاریخ" "مہر نیم روز" کے علاوہ اُن کی مثنویات بعنوان "بیانِ شانِ نبوت و ولایت"، "چراغِ دیر" اور "ابرِ گہربار" کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ "این میری شمل بحیثیت غالب شناس" کے عنوان سے شامل مضمون میں بھی زیادہ تر توجہ فارسی اشعار ہی کے انگریزی تراجم پر کی گئی ہے۔

غالب کے فارسی متون کا مطالعہ تہذیبی، ثقافتی اور روحانی حوالوں سے کیا گیا ہے۔ ان مضامین میں تحقیق کی بنیاد بھی انھی عناصر کو بنایا گیا ہے اور تحقیق کے تحت کاری انداز سے گریز کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کے نزدیک "استخواں شماری" کا یہ کام "غالب کا علمی سرمایہ" کھنگالنے والے "ممتاز" غالب شناسوں ہی کو زیبا ہے۔

فارسی مکاتیبِ غالب کا مطالعہ کرتے ہوئے حیات و واقعات کے ساتھ ساتھ غالب کی شخصیت کی بعض صفات پر بات کرتے ہوئے یہ واضح کیا گیا ہے کہ غالب کا احساسِ نسبِ عالی ان خطوط میں کس طرح جلوہ گر ہو رہا ہے۔ یہ خطوط تحقیق سفر کے بارے میں غالب کے بعض تصورات و افکار کے بھی آئینہ دار ہیں اور اپنے عہد کی بعض شخصیات کے عکاس بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ان صفحات میں سفرِ کلکتہ سے وابستہ بعض واقعات اور آگرہ کی یادوں کو بھی رقم کیا گیا ہے لیکن سب سے دلچسپ چیز غالب کے خور و نوش و پیراہن کے ذوق سے متعلق اظہارات ہیں۔ مکاتیبِ غالب کے اسلوب پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر تحسین فراقی نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ

"مراسلے کو مکالمہ بنانے کا جو دعویٰ غالب اُردو مکاتیب میں کرتے ہیں اس کی

اولیں نمود مع اعلان اُن کے بعض فارسی مکاتیب ہی میں ہوئی ہے اور مراسلے کو
مکالمہ بنانے کا فن درحقیقت اُن کے ذوقِ حضور کے ذور کا نتیجہ ہے۔"(۴۲)

مکاتیب غالب کو عصری تناظر میں دیکھتے ہوئے ڈاکٹر تحسین فراقی نے "پنج آہنگ" سے ایک اقتباس نقل کیا ہے اور غالب کے عصر کو اپنے زمانے سے جوڑ کر دیکھا ہے۔ بالکل ویسے جیسے ناصر نے اپنے عہد کی رات کو میر کے عہد کی رات سے ملایا تھا۔ غالب کہتے ہیں:

> "اب صورت یہ ہے کہ سفلوں اور کم ظرفوں کی بن آئی ہے۔ دادگاہ کا حال داد خواہوں سے زیادہ تباہ کن اور ان کے دل چشم بے وفایاں سے سیاہ تر ہیں۔ جب سے یہاں آیا ہوں، دن رات یہی کچھ دیکھ رہا ہوں۔ نہ کسی میں مروت ہے، نہ خلوص، نہ کم خود بین و خود پسند۔ ہر طرف زوال کے آثار ہیں۔ ایک عالم اس تباہی سے نالاں ہے لیکن اس کے اسباب پر کسی کی نظر نہیں۔"(۴۳)

مذکورہ مضمون میں "پنج آہنگ" کے جائزے کے لیے اُن کے پیشِ نظر محمد عمر مہاجر کا اُردو ترجمہ ہے اور اُس سے اقتباسات درج کیے گئے ہیں۔ تاہم اس کے ترجمے کا تجزیہ نہیں کیا گیا۔

مثنوی "بیانِ نموداری شانِ نبوت و ولایت کہ از حقیقت پرتو نور الانوار حضرتِ الوہیت است" کے بارے میں مولانا حالی نے "یادگارِ غالب" میں یہ بتایا ہے کہ غالب کی یہ تخلیق مولانا فضلِ حق خیر آبادی کی فرمائش پر رقم کی گئی اور یہ شاہ اسمٰعیل شہید کی تصنیف "تقویۃ الایمان" کے بعض مندرجات کا منظوم جواب ہے۔

شاہ اسمٰعیل نے اپنی تصنیف میں "اشراک فی التصرف" کے باب میں لکھا تھا کہ اللہ ایک حکم کن سے چاہے تو کروڑوں نبی اور ولی، جن اور فرشتے، جبریل اور محمد ﷺ کے برابر پیدا کر ڈالے۔ اس کے جواب میں غالب نے کہا کہ یہ از راہِ عجز نہیں، از راہِ اختیار ہے۔ نبی اکرم بے مثال ہیں۔ خدا اپنے محبوب کے ساتھ سایہ بھی پسند نہیں کرتا تو ان جیسا اور تخلیق کرنا کیوں گوارا کرے گا۔

منفرد اندر کمالِ ذاتی است
لاجرم مثلش محالِ ذاتی است

نبی کریم ﷺ کے بارے میں اس نوعیت کے افکار و خیالات عجمی تہذیب میں اپنی بھرپور جدلیاتی صورت میں موجود ہیں۔ ہماری مذہبی دانش رسول اکرم ﷺ کی ہستی اور صفات کے بارے میں جس

مبارزت کی صورت حال میں گھری ہوئی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کا یہ مضمون غالب کی مثنوی کے تناظر میں شاہ اسمٰعیل کے افکار نیز اس کے اسلوب اظہار کی تفہیم کی ایک کوشش ہے اور اس سلسلے میں ان کا نتیجۂ بحث یہ ہے کہ:

"شاہ صاحب کے مزاج اور تحریر میں ضرورت سے زیادہ شدت نہ ہوتی تو ان کے موقف کو معروضی انداز میں سمجھنے کی بہتر کوششیں ظہور میں آتیں۔ بہرحال المیہ یہ ہے کہ بدعات و توہمات کا یہ کھیل برعظیم پاک و ہند میں آج بھی اسی شدت اور نت نئی صورتوں میں جاری و ساری ہے اب سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری"(۳۶)

یہ حقیقت ہے کہ مرد مومن ہندی آج بھی مولوی شاہ اسمٰعیل اور "پیر" فضل حق کے مابین مبارزت جبر و قدر کا کشتہ ہے اور نامعلوم کب تک رہے گا۔

غالب کے فارسی تخلیقی اثاثے میں مثنوی "چراغ دیر" ایک سو آٹھ اشعار پر مشتمل ہے اور اس کی بحر ہزج مسدس محذوف ہے۔ اس مثنوی میں غالب نے شہر بنارس کے حسن کی منظر کشی کرتے ہوئے جمال شہر کے ساتھ اہل جمال شہر کا ذکر نہایت سرشاری کے ساتھ کیا ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس مثنوی کا جائزہ اس کے اسلوب شعر کے تناظر میں کیا ہے اور اس کے عروضی مطالعے کے ساتھ ساتھ محاکات اور تراکیب کے وصف پر بات کرتے ہوئے اس کا تقابل غنیمت کنجاہی کی مثنوی "نیرنگ عشق" سے جس کا سن تصنیف ۱۶۸۵ء یعنی "چراغ دیر" سے ڈیڑھ سو برس قبل ہے، کیا ہے۔ لیکن اس تقابل کو محض مثنویات تک محدود نہیں رکھا بلکہ غالب کے اردو کلام سے بھی بعض اہم تراکیب کو اس جائزے میں شامل کیا ہے۔ مثلاً:

دل ہر ذرہ در جوش انا الشرق (غنیمت)
دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر (غالب)

ڈاکٹر تحسین فراقی نے دونوں مثنویوں کے بعض اشعار کو آمنے سامنے رکھ کر تقابل کیا ہے۔ چند امثال ملاحظہ ہوں:

غالب	غنیمت
ادائے یک جہاں جلوہ سرشار	ادائے او ہزاراں جلوہ پروش
خرامے صد قیامت فتنہ دربار	نگاہ او رم آہو در آغوش
ز انگیز قد ، انداز خرامے	ز انگیز بدن برگشتہ گاہے
بپائے گلبنے ، گستردہ دامے	ز ہر مغشوش عیاں رخسار دیگر
ز رنگیں جلوہ ہا غارت گر ہوش	ز حسن دلبران غارت ہوش
بہار بستر و نوروز آغوش	تماشا داشت صد کنعاں در آغوش

مذکورہ امثال اور "چراغِ دیر" کے تجزیے سے یہ امر قطعی طور پر واضح نظر آتا ہے کہ غالب اس مثنوی میں جا بجا "نیرنگِ عشق" سے استفادہ کرتے نظر آتے ہیں لیکن کسی بھی جگہ مذکورہ استفادے یا اثر پذیری کا اشارہ تک نہیں کرتے۔

غالب نے بیدلؔ سے متاثر ہونے اور اُس کے رنگ میں کلام کرنے کا اعتراف کیا ہے مگر بعد ازاں اُن کے اثر سے آزاد ہوتے گئے جبکہ غنیمت کے شعر کو لائقِ التفات ہی خیال نہ کیا۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے مذکورہ حقائق کی روشنی میں "چراغِ دیر" کے جائزے کے اختتام پر لکھا ہے:

> "نیرنگِ عشق اور چراغِ دیر دونوں فارسی مثنویات میں بے مثل ہیں۔ غالب کی شاعری پر ممتاز فارسی گو اساتذہ کے اثرات کا جائزہ کسی مردِ میدان طلب کا منتظر ہے۔ غالب شناسی کے حوالے سے ان اثرات کی نشان دہی نہایت درجہ ضروری ہے تا کہ غالب کی تخلیق دین کا صحیح صحیح تعین کیا جا سکے۔"(۴۰)

"چراغِ دیر" کی طرح غالب کی مثنوی "ابرِ گہربار" بھی اُن کی ایک باکمال تخلیق ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ موضوعاتی اعتبار سے دونوں فن پاروں میں اختلاف ہے۔ ایک ہزار سے زائد اشعار پر مشتمل اس طویل مثنوی میں حمد، نعت اور منقبت کے مضامین بہ کثرت ہیں۔

"ابرِ گہربار" کے زمانۂ تصنیف کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہوگا۔ یہ پہلی بار ۱۸۶۳ء میں غالب کے کلیات میں شائع ہوئی اور ۱۸۶۳ء میں اکمل المطابع دہلی سے اشاعت پذیر ہوئی۔ لیکن

سرسید کی "آثار الصنادید" اور بعض دیگر شواہد کی روشنی میں ۱۸۳۶ء کے آس پاس اس کی تخلیق کا عمل شروع ہو چکا تھا اور غالباً بعض حصے مکمل بھی ہو چکے تھے۔ بعض تحقیقات کی روشنی میں یہ نامکمل حالت میں ہے اور غالب اس میں غزوات رسول کا جو تذکرہ کرنا چاہتے تھے وہ نہ کر سکے اور دستیاب حصہ تمہیدی اشعار پر مشتمل ہے۔

"ابر گہر بار" کے بارے میں یہ تحقیقات اس امر کی بھی غماز ہیں کہ یہ غالب کا ایک بڑا شعری منصوبہ تھا جو بہ وجوہ تکمیل پذیر نہ ہو سکا۔

فکری لحاظ سے غالب کی افتادِ طبع کا جو عکس اس تخلیق سے سامنے آتا ہے اس کی روشنی میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے اسے "کلید" قرار دیا ہے جس سے غالب کی شخصیت کے بہت سے در وا ہوتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> "غالب کی تفہیم کے لیے اس مثنوی کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ بلکہ مثنویوں کے ساتھ ساتھ اُن کے فارسی قصائد بھی پیش نظر رہنے چاہئیں۔ اپنے فارسی کلام کی طرف متعدد بار توجہ دلانے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ پورا غالب تو اُن کے فارسی کلام کو پڑھ کر ہی سمجھ میں آ سکتا ہے۔"(۱۵)

مثنوی "ابر گہر بار" یقیناً اپنے باطن میں روحانیت کے بے شمار درخشندہ عناصر رکھتی ہے۔ خدا کے حضور عجز و نیاز، انبیائے کرام کی تعظیم بہ طور خاص رسول اکرم سے محبت اور دعا و مناجات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ غالب پر لکھنے والے بعض اہل نقد نے اُن کی شخصیت میں تشکیک و الحاد کے جن پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے، انھوں نے مطالعۂ غالب کُلی اعتبار سے نہیں کیا۔ ذیل میں اس مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نبی قبلۂ آدمی زادگاں
نظر گاہ پیشیں فرستادگاں
بلندی دہ کعبہ بالائے او
گرامی کن سجدہ، سیمائے او
یمن روشن از پرتو روئے او
ختن بستۂ چین گیسوئے او
کہ تا گردش چرخ نیلوفری
بود سبز جالش بہ پیغمبری

ادب ورز و دیں جو و آئیں گزیں
بہ فنِ سخن شیوۂ دیں گزیں
بہ راہے کہ پویہ گز پائے تو
درخشد چو خورشید سیمائے تو
بہ کارے زدی دست گز ساز تو
دمِ جبرئیل است ہمراز تو
ترا بخت در کار یاری دہاد
بہ نہجم دیں استواری دہاد

مذکورہ اشعار کی روشنی میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ غالب کا باطن کس قدر منور تھا اور تیقن کی اس روشنی نے انھیں گم کردہ راہی نہیں بننے دیا۔ بہ طور ایک تخلیق کار غالب کے شعری مزاج کا جو عکس اس نوعیت کے اشعار میں ظاہر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کا درج ذیل سوال و دعویٰ اہلِ نظر کے لیے یقیناً لائق غور ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "مجھے کہنے دیجیے کہ دینی ادب کا، جس کا ایک نام اسلامی ادب بھی ہے، نعرہ بلند کرنے والا پہلا شاعر غالب تھا۔ خود کو مشورہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ ادب اختیار کر! دین کی تلاش کر! آئین اپنا اور فنِ سخن میں شیوۂ دین اختیار کر! فنِ سخن میں شیوۂ دین اختیار کرنے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ ادب کا قبلہ درست کیا جائے اور اسے اس حقیقت سے منسلک کر دیا جائے جو حقیقۃ الحقائق اور نور الانوار ہے۔" (۴۳)

غالب کے دینی میلانات کے تناظر میں مثنوی "دعائے صباح" کا مطالعہ بھی کیا جائے تو ایک اور زاویہ سامنے آ سکتا ہے۔ ۱۲۰ اشعار پر مشتمل یہ مثنوی حضرت علیؓ سے منسوب ایک دعا کا ترجمہ ہے اور غالب کی وفات سے دو برس قبل شائع ہوئی۔

مرزا اسداللہ خان غالبؔ کے ہاں دینی میلانات جہاں اُن کی بعض فارسی مثنویات میں ملتے ہیں۔ وہاں شاہانِ تیموری کی تاریخ "مہر نیم روز" کے متعدد جات بھی اس کی گواہی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی

نے غالب کی اس تصنیف کا جائزہ اس نقطۂ نظر سے لیتے ہوئے اسے گہرے دینی شعور اور معرفت کی رائیگانی پر تاسف کی دستاویز قرار دیا ہے۔ اپنے جائزے میں انھوں نے سید رحمت علی خان بہادر کی تصنیف "سراج المعرفت" کے غالب کے تحریر کردہ دیباچے، حالی کی کتاب "یادگارِ غالب" اور بعض مکاتیب سے اقتباسات کا بھی برمحل حوالہ دیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ عمر ڈھلنے کے ساتھ ساتھ غالب پر عبدیت کا احساس کس قدر غالب آ گیا تھا۔ ذیل میں غالب کے مذکورہ منقول بیانات سے چند سطور ملاحظہ ہوں:

"میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوا ہوں۔۔۔۔ محمد پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ ختم المرسلین اور رحمت للعالمین ہیں۔" (مکتوب بنام علائی)

"میں موحد ہوں۔ ہمیشہ تنہا اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں لا الٰہ الا اللہ۔ لا موجود الا اللہ۔ لا موثر فی الوجود الا اللہ۔" (یادگار غالب)

"جی میں آیا کہ اس کتاب مستطاب "سراج المعرفت" کا دیباچہ لکھیے اور پھر میں برگ و ساز کروں اور عزم سفر حجاز کروں۔ زمزم کے پانی سے وضو کروں اور اس کاشانۂ ملائک آشیانہ کے گرد پھروں اور حجر اسود کو چوموں اور پھر وہاں سے مدینہ منورہ جاؤں اور خاک تربت اطہر کا سرمہ آنکھوں میں لگاؤں۔"

"ہم تباہ حال سیہ کار کہ نہ جن کے ہاتھ میں عصا ہے نہ پاؤں میں طاقت ہے، نہ چراغ فراہم ہے نہ چاند رات کہ اس کی روشنی میں رات کا سفر کیا جا سکے، نہ آوازِ درا اور نہ فرشتے کی آواز کان میں پڑتی ہے۔ ہم اس ہولناک اور وحشت ناک گزرگاہ کو کیسے عبور کریں گے اور ایسے میں ہم پر کیا قیامتیں نہ گزر جائیں گی۔ کاش باز پرس کے بغیر ہی ہمیں بخش دیا جائے۔"

ممتاز جرمن مستشرق این میری شمل نے جہاں رومی، اقبال، تصوف اور ہندوستانی تہذیب کے سلسلے میں لائق ذکر کام کیا، دلّی سے ۱۹۷۹ء میں شائع ہونے والی اُن کی تصنیف "A Dance of Sparks" غالب کی شاعری میں شرر اور آگ کی تمثالوں کے حوالے سے لائق مطالعہ ہے۔ اس کتاب کا مقصد بقول این میری شمل غالب کی تمثال کاری کے ایک پیچیدہ نظام سے مغربی قاری کو متعارف کرا کے اس کو تمثال ادبیات کے میدان تک رسائی دینے کی تمنا ہے۔

این مری شمل اپنی اس آرزو کو بر لانے میں بہت حد تک کامیاب ہوئی ہیں اور غالب کی شاعری کے ایک ایسے پہلو کو اجاگر کیا ہے جو عالمی شاعری میں بعض اہم شعرا کے ہاں خاص ہے اور انھوں نے اپنی شاعری میں آگ کی تمثالوں کو اپنے اسلوب کا نمایاں وصف بنایا ہے۔

"A Dance of Sparks" کی اہمیت ڈاکٹر تحسین فراقی کے نزدیک کیا ہے اس سلسلے میں اُن کا یہ بیان ملاحظہ ہو:

> ''شمل نے اپنی کتاب "A Dance of Sparks" (تمثالِ رقصِ شرار) میں غالب کی اُردو اور فارسی شاعری سے ایسے اشعار چنے اور ان کا محاکمہ کیا ہے جو شرر، شعلے یا آگ کی تمثالوں کے توسط سے غالب کے باطنی محسوسات کو بیان کرتے ہیں۔ اس باب میں شمل نے بعض مقامات پر قابلِ قدر نکات اٹھائے ہیں۔ تاہم یہ کہنا بے محل نہیں کہ شمل سے پہلے بھی بعض نقادوں نے شعلہ و آتش کی تمثالوں کے حوالے سے بعض فکر افروز باتیں کی ہیں۔''(۵۳)

این مری شمل کی اس کتاب کا جائزہ ڈاکٹر تحسین فراقی نے دو پہلوؤں سے لیا ہے۔ ایک اس کتاب کے مباحث دوسرا اشعار کے تراجم۔ اوّل الذکر پہلو کے حوالے سے ڈاکٹر تحسین فراقی کے تجزیے کا ماحصل یہ ہے کہ شمل کے مقالے "Ghalib's Qasida in Honour of the Prophet" میں غیر معمولی عقیدت اور عشق کی گہری صداقت نظر آتی ہے۔ غالب کے ہاں آگ کی علامت نو بہ نو پیرایوں میں جلوہ گر ہوتی ہے لیکن شمل نے بعض اہم اشعار سے استشہاد نہیں کیا۔

اُن کے بعض بیانات کی صداقت بھی محلِ نظر ہے۔ خصوصاً میر عبدالصمد کے بارے میں اُن کا بیان کہ غالب نے اُن سے فارسی زبان کی نزاکتیں سیکھیں۔ دار و رسن کی ترکیب ہند و فارس کی شاعری میں بہت پہلے سے مروج تھی جبکہ شمل کے مطابق اسے غالب کے بعد مرکزی موضوع کا درجہ نصیب ہوا۔

این مری شمل کے ترجمے کے سلسلے میں ڈاکٹر فراقی کا تجزیہ ہے کہ اشعار کے ترجمے میں اُن کی کمزوری کئی ایک حوالوں سے ظاہر ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ بعض علامات و تلازمات کے سلسلے میں بھی اُن کا ادراک مستحکم نظر نہیں آتا۔ وہ غالب ایسے بے مثال اور عمیق و دقیق شاعر کے متعدد معانی سے سرسری گزر گئیں۔

بحیثیت مجموعی ڈاکٹر تحسین فراقی نے این مری شمل کے بارے میں بہت متوازن رائے دی ہے۔ لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ این میری شمل نے مغربی قارئین سے غالب کے فکر و فن کو متعارف کرانے کے لیے جو متعدد علمی کاوشیں کیں وہ یقیناً لائقِ داد ہیں۔ جگہ جگہ ان کی نکتہ آفرینی قارئین سے خراجِ توصیف بھی وصول کرتی ہے مگر یہ طے ہے کہ تجزیہ اور تحلیل میں ازل کا بیر ہے۔ اے کاش وہ فارسی ادبیات کی تحصیل زیادہ استقلال اور تسلسل سے کرتیں اور اپنے لکھنے کی رفتار پر روک لگاتیں۔"(۱۰)

ڈاکٹر تحسین فراقی کی تحقیق و تنقید کا ایک نمایاں وصف فروگزاشتوں اور کوتاہیوں کی جانب مثبت نشان دہی کے ذریعے کاملیت کی تلاش بھی ہے۔ اس سلسلے میں اُن کا رویہ بعض مقامات پر قدرے سخت گیر بھی نظر آتا ہے لیکن بہت کم ایسا ہوتا ہے اُن کی علمی وسعت اور خلوص والی اسے ناگوار ہونے دے۔

اس تناظر میں اُن کی تصنیف "دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ (اصل حقائق)" کو دیکھا جائے تو یہ دیوانِ غالب کی تدوین کے سلسلے میں ایک ایسی دستاویز کی حقیقت سامنے لاتی ہے جو فروگزاشت اور کوتاہی کی منزل سے قدرے آگے کا مقام رکھتی ہے اور حقائق کی روشنی میں اس پر غالب کی ترکیب "متاعِ بُردہ" صادق آتی ہے۔

جامعہ پنجاب کے مرکزی کتب خانے میں "دیوانِ غالب" کا ایک نسخہ موجود تھا جس پر رسائی نمبر ۲۸۱۲ درج کیا گیا تھا۔ اس کا ذکر امتیاز علی خاں عرشی نے "نسخۂ عرشی" میں بھی کیا ہے اور اس کا ایک روٹوگراف رضا لائبریری رام پور میں محفوظ بھی ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے ماہِ نو، کراچی کے شمارہ جولائی ۱۹۵۳ء میں اس نسخے کا تعارف کرایا اور بعد ازاں قاضی عبدالودود نے نقوش لاہور کے شمارہ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں اس نسخے کے بارے میں ایک شذرہ رقم کیا۔

مذکورہ نسخہ گورنمنٹ کالج لاہور کے سابق پرنسپل جناب خواجہ منظور حسین سے موسوم ہو کر "دیوانِ غالب ـــ نسخۂ خواجہ" کے عنوان سے مدوّن ہوا اور ۱۹۹۸ء میں منظرِ عام پر آیا لیکن صاحبِ تدوین کی طرف سے نسخے کی اصل حقیقت کے بارے میں کسی نوع کا اعتراف کیے بغیر نہ صرف یہ دعویٰ کیا گیا کہ انھیں یہ نسخہ "پرانی کتابوں کے ایک کاروباری سے ملا" بلکہ اس کا رسائی نمبر کھرچ دیا گیا اور صفحۂ آخر پر جہاں مدور مہر لگائی گئی تھی وہاں "شفتے زین" کے نام کی چیپی چسپاں کر دی گئی۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے دستاویزات کی فراہمی کے ساتھ نہایت تحقیق سے اپنا یہ موقف ثابت کیا ہے کہ نسخۂ خواجہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور کا گم شدہ مسروقہ نسخہ ہے اور مدون نے اسے اپنی دید و دریافت قرار

دے کر اسجاد رہے کی سرقہ بازی کا ثبوت دیا ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے نہ صرف حقائق کی دریافت اور فراہمی کا کام کیا بلکہ اس نسخے کی تدوین کے سلسلے میں بعض فروگزاشتوں کو سامنے لائے جو درج ذیل ہیں:

i۔ نسخۂ خواجہ میں متنی تحقیق کے سلسلے میں نسخۂ عرشی کی اندھا دھند تقلید کی گئی ہے۔

ii۔ کتابت کی بے پناہ اغلاط موجود ہیں۔

iii۔ تدوینِ شعر میں غالب کے منشائے املا کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے لیکن غالب کے تصورات لغت و املا سے مرتب کو واقفیت معلوم نہیں ہوتی۔

iv۔ نسخۂ خواجہ میں اوقاف کی وہی بھرمار ہے جو نسخۂ عرشی میں نظر آتی ہے۔

v۔ مدون نے نسخے کے متن میں رہ جانے والے الفاظ کو قلابوں میں لکھنے کا اہتمام نہیں کیا۔

vi۔ فہرستِ اشعار نہ ہونے سے قرأت میں اُلجھن پیدا ہوتی ہے۔

vii۔ مقدمے میں دیگر لکھنے والوں کی نقل کی گئی تحریروں کی صحتِ متن کا خیال نہیں رکھا گیا۔

viii۔ فارسی متن میں بے شمار اغلاط ہیں اور جا بہ جا اضافتوں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ نیز طرزِ املا کی بھی دو عملی نظر آتی ہے۔

ix۔ فارسی متن کا ترجمہ محلِ نظر ہے اور بے شمار مقامات پر اغلاط نمایاں ہیں۔

نسخۂ خواجہ کے اصل حقائق کی دریافت و نیز متن کی تدوین کی فروگزاشتوں کی تفصیل کے بعد ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنی بحث کو ان الفاظ میں سمیٹا ہے:

"اُمید واثق ہے کہ مندرجہ بالا گزارشات کے پیشِ نظر اور مذکورہ عکسی شواہد کی موجودگی میں قارئین فوراً بسہولت اندازہ لگا لیں گے کہ بظاہر تین نسخوں کی یہ مزعومہ حقیقت اصل میں ایک ہی نسخے کی توحید کی داستان بیان کر رہی ہے اور یہ داستان ہے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے قلمی نسخے کی گم شدگی اور نسخۂ خواجہ کی صورت میں اس کے ظہورِ ثانی کی۔ رہی یہ بات کہ اس قلمی نسخے کی بازیافت کب تک ممکن ہے سو اس باب میں غالب ہی کا یہ شعر بڑی اُمید دلاتا ہے:

دیکھیے پاتے ہیں "عشاق" بتوں سے کیا "فیض"
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے"(44)

"دیوانِ غالب ـــ نسخۂ خواجہ (اصل حقائق)" کی اشاعت کے بعد ایک جوابی کتابچہ "دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ ـــ صحیح صورتِ حال" کے عنوان سے شائع ہوا۔ جس میں ڈاکٹر تحسین فراقی کے پیش کردہ حقائق کو مسترد کرنے کی کوشش کی گئی۔

سید قدرت نقوی نے "دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ یا مسروقہ ـــ ایک جائزہ" کے عنوان سے ایک علمی مقالہ رقم کیا جس میں ڈاکٹر تحسین فراقی کی جانب سے بتائے گئے تسامحات کے علاوہ بعض دیگر فروگزاشتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر عارف ثاقب نے "دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ اصل حقائق اور دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ صحیح صورتِ حال ـــ ایک تقابلی جائزہ" کے عنوان سے شائع کیا جس میں ڈاکٹر تحسین فراقی کے اعتراضات اور جوابات کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا کہ اعتراضات مدلل جبکہ جوابات کمزور اور بے جان تاویلوں پر مشتمل ہیں۔

"دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ (اصل حقائق)" میں اٹھائے گئے مباحث اور مذکورہ جوابات کی روشنی میں ہندو پاک میں ڈاکٹر تحسین فراقی کی کاوش کی بہت پذیرائی ہوئی اور متعدد اہلِ علم و بصیرت نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ذیل میں چند آرا نقل کی جا رہی ہیں:

"تحسین فراقی کا کتابچہ اصل حقائق، دقیق اور عالمانہ تحقیق کا ایک بہت اچھا نمونہ ہے۔۔۔ تحسین کے کتابچے کے آخر میں ڈاکٹر سید عبداللہ کے نسخے، عرشی صاحب اور قاضی عبدالودود کے نسخے اور نسخۂ خواجہ کے بعض صفحات کے جو عکس دیے ہیں ان کی وحدت [illegible] کو بھانپنے کے لیے کسی ماہرِ تحریر کی ضرورت نہیں، ایک عطائی بھی بہ یک نظر پہچان سکتا ہے کہ یہ ایک ہی نسخے کے عکس ہیں۔"

"تحسین نے فارسی متن کی قرأت اور اردو ترجمے میں جو تصحیحات تجویز کی ہیں وہ۔۔۔ مایۂ فخر ہیں، اس سے مجھے یہ تذبذب ہو گیا ہے کہ تحسین شعبۂ اردو کے استاد ہیں یا شعبۂ فارسی کے۔ انھوں نے نسخۂ خواجہ سے بیشتر ان شعروں کے ترجموں کی جو تفصیلی نشان دہی کی ہے وہ کم از کم میری معلومات میں اضافہ ہے۔" (ڈاکٹر گیان چند ـــ ماہنامہ "سورج"، جنوری ۲۰۰۱ء)

"I never knew that this young professor possessed far more scholarly shrewdness than the distinguished scholars from India and Pakistan who have been complimenting Dr. Moeen for his discovery. Should. I treat Tehseen Firaqi too as a rare discovery brought before us

through Nuskha-e-Khawaja?"

(Intizar Hussain, The Dawn, June 4, 2000)

"سید صاحب موصوف نے فراقی صاحب کے بے شمار وزنی اعتراضات میں سے کسی ایک اعتراض کا جواب بھی نہیں دیا ہے بلکہ

جواب خط پہ وہ غور مسلسل
لکیریں سی بنا کر رہ گئے ہیں

البتہ ڈاکٹر تحسین فراقی کے اعتراضات کی کلیتہً تائید کے علاوہ مزید اعتراضات وارد کرتے ہوئے ملک کے مقتدر ارباب فضل وکمال نے اعلائے کلمۃ الحق کے ضمن میں غالب شناسی کا حق ادا کر دیا ہے۔۔۔ سید معین الرحمان نے یہ نسخہ (نسخۂ لاہور) کسی کباڑی سے خریدنے کی جو کہانی گھڑی ہے، وہ کذب بیانی کے سوا کچھ نہیں۔۔۔ سید صاحب کسی مخطوطے کو پڑھنے اور اسے مرتب کرنے کی صلاحیت سے عاری ہیں اسی لیے ان کے مرتبہ نسخۂ خواجہ میں لغزشوں کی بھرمار ہے۔"

(خلیل الرحمٰن داؤدی، لاہور، ماہنامہ سورج، جنوری ۲۰۰۱ء)

"تحقیق نامہ میں آپ کا خط پڑھا "نسخۂ لاہور" سے متعلق۔ آپ نے یہ کیوں نہیں لکھا کہ یہ دراصل نسخۂ لاہور ہی ہے۔ ملکیت بدل جانے سے اصلیت تو نہیں بدلتی۔"

(رشید حسن خاں، ۲۸ جولائی ۱۹۹۹ء)

"تحسین صاحب کا لائق تحسین رسالہ نسخۂ خواجہ سے متعلق ایک صاحب نے عنایت کیا ہے۔ اس قسم کی مجاہدانہ تحریریں بہت کم دیکھنے کو آتی ہیں۔ اللہ مزید کی توفیق اور مواقع عطا کرے۔"

(ڈاکٹر انصار اللہ علی گڑھ بنام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، مورخہ ۱۹ اگست ۲۰۰۰ء)

"دیوان غالب نسخۂ خواجہ ـــ اصل حقائق" کا ایک نسخہ موصول ہوا جس کے لیے شکر گزار ہوں۔ اس موضوع پر بات ہونی چاہیے تھی۔ خوشی کی بات ہے کہ اس کا آغاز آپ نے کیا۔"

(ڈاکٹر جمیل جالبی، کراچی، ۱۹ اپریل ۲۰۰۰ء)

"آپ کی کتاب "دیوان غالب نسخۂ خواجہ ـــ اصل حقائق" نظر سے گزری۔ بے ساختہ آپ کی ژرف نگاہی کی داد دینے کو جی چاہا۔ آپ کی معلومات کی وسعت اور تحقیق کا مزید قائل ہو گیا۔ اردو ادب کے حوالے سے اسے نئی صدی کے پہلے بڑے انکشاف سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ مقام اطمینان ہے کہ اس دور میں بھی شیوۂ شیرانی کی پیروی جاری ہے۔" (افضل حق قرشی، لاہور)

"حال ہی میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے ایک تحقیقی کتاب لکھی ہے جس کا نام "دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ ـــ اصل حقائق" ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ نسخۂ خواجہ درحقیقت نسخۂ لاہور ہی ہے جسے پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے چرا لیا گیا تھا۔ میں ڈاکٹر تحسین فراقی کو اس جرأت مندانہ تحقیق پر داد دیتا ہوں۔"   (پروفیسر لطیف الزماں خاں، منقولہ "پاکستان" ۱۴ مئی ۲۰۰۰ء)

"کبھی کبھار ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری زندگی کے تقریباً سبھی شعبے ناجائز تجاوزات کا شکار ہو گئے ہیں۔ دیگر شعبوں کی طرح ادب کا شعبہ بھی ہمارے اسی غیر ذمہ دارانہ سوچ رویے سے روز بروز سمٹتا جا رہا ہے۔ عام گلی محلوں اور بازاروں میں ایسے تجاوزات ہٹانے کا عمل شروع ہو تو رکے ہوئے راستے کھل جاتے ہیں اور بظاہر بڑی دکانیں تنگ ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ اُردو ادب میں بھی ایسے تطہیری عمل کی سخت ضرورت ہے جس کے آغاز کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یہ خوش آئند بات ہے کہ ادب کے اہم ترین شعبے یعنی تحقیق میں "عمل صفائی" کا یہ عمل شروع ہو گیا ہے جس کا سہرا ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب کے سر ہے۔ بازارِ تحقیق میں جو صاحب تجاوزات کیے بیٹھے تھے اور اس پاڑہ مارکیٹ میں اپنی دکان جس دل مسروقہ سے سجا رکھی تھی وہ ڈاکٹر موصوف کے سوٹ عمل سے اتنی مختصر ہو گئی ہے کہ کسی سے پوچھے بغیر اس کا اتا پتا معلوم نہیں ہوتا۔"

(محمد اکرام چغتائی، ڈائریکٹر جنرل اُردو سائنس بورڈ، لاہور)

"ان (تحسین فراقی) کی کتاب دیکھ کر مسرت ہوئی کہ انھوں نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس "سومنات شکنی" پر انھیں میری طرف سے مبارک باد کہہ دیجیے گا۔"

(پروفیسر اشرف بخاری (پشاور) بنام محمد احسن خاں)

"ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنے موقف کی تائید میں جو سب سے وزنی دلیل دی ہے وہ یہ ہے لائبریریوں کے ضابطے کے مطابق لائبریری کی ہر کتاب کا ایک خفیہ صفحہ بھی ہوتا ہے جو کہ ایک مخصوص صفحہ اور مہر شدہ ہوتا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا بھی ایک مخصوص صفحہ ہے۔ چنانچہ احتیاطی طور پر اس خاص صفحے پر جس کا نمبر ۲۲ ہے وہ مہر کھرچ دی گئی ہے تاکہ یہ لائبریری کی کتاب ثابت نہ ہو سکے۔ اس بات کا معین صاحب نے اب تک کوئی جواب نہیں دیا اور اس حساب سے سارا معاملہ واضح کے خلاف جاتا ہے جب تک کہ مذکورہ کباڑیا اس کی فروخت کی تصدیق نہ کرے حال آنکہ ایسے نایاب نسخے کا کسی کباڑیے تک پہنچنا بجائے خود ایک بہت بڑا سوال ہے جس کا جواب بھی خود معین صاحب ہی

پر واجب ہے۔"   (ظفر اقبال ــ ہفت روزہ زندگی، لاہور، ۲۷ اگست تا ۲ ستمبر ۲۰۰۰ء)

سرقۂ مخطوطۂ دیوانِ غالب کی سراغ یابی پر

عصرِ نو یہ رنگ تیرا قابلِ افسوس ہے ۔۔۔ جو بھی کرگس ہے بزعمِ خویش وہ طاؤس ہے
ڈاکٹر تحسین فراقی نے کیا یہ راز فاش ۔۔۔ قید سارق سے بڑا چوری کا یہ ملبوس ہے
جب کہی تاریخ ہاتف نے تو تھیدا کہا ۔۔۔ اے خدا تو دیر گیر و قاہرہ قدوس ہے

نسخۂ مملوکۂ پنجاب یونیورسٹی

<u>نسخۂ مسروقۂ گنجینۂ مانوس ہے</u> (ہاتف زعفرانی)

۱۴۲۱ھ

(۳)

جدید اُردو نظم کے عظیم معمار ن م راشد کے فکر و فن پر مطالعات کی روایت اُردو شاعری کی تنقید کی ایک اہم بحث ہے۔ تاہم یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ن م راشد شناسی کا یہ سفر قدرے دیر سے شروع ہوا یا کم از کم یہ کہنا چاہیے کہ راشد پر تواتر سے لکھنے کا عمل بہت بعد میں آغاز پذیر ہوا۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے غالب اور اقبال کے بعد جس شاعر کو اپنی تحقیق و تنقید کا ایک سنجیدہ موضوع بنایا ہے، وہ ن م راشد ہیں۔ اس سے قبل کہ اس موضوع پر اُن کی کاوشوں کا بالتفصیل ذکر کیا جائے، ن م راشد کے بارے میں اُن کا زاویۂ نظر معلوم کر لیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"میں ن م راشد کی شخصیت اور شاعری کا جب بھی تصور کرتا ہوں، میرے آئینۂ خیال میں ایک ایسے شخص کی شبیہ اُبھرتی ہے جو سراپا اضطراب تھا ــ اک اضطراب مسلسل غیاب ہو کہ حضور، یہ اضطراب مسلسل انھیں کہاں کہاں لیے نہیں پھرا۔ مختلف جغرافیائی منطقوں سے لے کر فکر کی گہری گپھاؤں تک۔ فارسی، انگریزی اور یورپی ادب کے گہرے مطالعے نے ان کی فکر کو ایک نئی دھار عطا کی اور ان کا اسلوبِ شعری ایک ایسے سانچے میں ڈھلا جس کے بڑے حصے پر ان کی انفرادیت کی مہر لگی ہے۔"(۵۹)

راشد کی شاعری اُن کے بعض معاصرین کی طرح چونکہ عوامی نہیں رہی لہٰذا ابتداً انھیں پر لکھنے کا عمل

قدرے سست رہا اور ۲۰۱۰ء میں جب اُن کا صد سالہ جشنِ ولادت منایا جانے لگا تو ادب کے سنجیدہ حلقوں میں نہ صرف ن م راشد شناسی کی رفتار میں تیزی لانے کا احساس پیدا ہوا بلکہ اُس کی سمت کو درست کرنے کا رجحان بھی سامنے آیا۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے سنجیدہ تنقید کے اس عمل میں شریک ہوتے ہوئے ن م راشد کے سلسلے میں درج ذیل دستاویزات مُفقد مرتب کیں:

i۔ حسن کوزہ گر

ii۔ کس دھنک سے مرے رنگ آئے

iii۔ چلا آرہا ہوں سمندروں کے وصال سے

iv۔ بازیافت (ن م راشد نمبر)

اوّل الذکر کاوش میں اُن کا ایک طویل مضمون بعنوان ''انھیں کیا خبر کس دھنک سے مرے رنگ آئے'' شامل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ن م راشد کے دو تین نایاب مصاحبے بھی اس دستاویز کا حصہ ہیں جو اُن سے ایرانی جرائد سے وابستہ افراد نے لیے۔ ان کے علاوہ پنجابی کے منفرد شاعر اور فرانسیسی زبان کے ممتاز عالم ڈاکٹر تحقیق بابری کے نام ن م راشد کے ۵ غیر مطبوعہ خطوط شامل ہیں۔

''انھیں کیا خبر کس دھنک سے مرے رنگ میں آئے'' کے عنوان سے ڈاکٹر تحسین فراقی کے مضمون میں درج ذیل اہم نکات پر گفتگو شامل ہے:

i۔ راشد کی شاعری کا فکری تنوع

ii۔ راشد اور اقبال کے مابین فکری اشتراکات و اختلافات

iii۔ راشد کی استعمار دشمنی

iv۔ راشد پر الحاد کے الزامات

v۔ راشد کے فنی تسامحات

راشد کا شعری تنوع فکری سطح پر بھی ہے اور اُن کی زبان میں بھی وہ خاص وصف موجود ہے جو شعریت کے لیے ناگزیر ہے۔ بقول ڈاکٹر تحسین فراقی ''عمر بھر کے تفکر کی وہ آتشیں رتھ راشد کے تصرف میں تھی جس پر سوار ہو کر وہ الفاظ و معانی کی تلاش میں نکلتے ہیں۔'' ن م راشد کا اقبال سے فکری تعلق تو ہے لیکن وہ اقبال کی توسیع محض نہیں۔ اُن کے اسلوب اور الفاظ و تراکیب سے بہت سے ایسے شواہد ملتے ہیں جو اس امر کے غماز ہیں کہ راشد اقبال سے متاثر ہی نہ تھے، اُن سے عقیدت بھی رکھتے تھے۔ ایران میں

اقبال شناسی کی کاوشوں کی آغاز پذیری کے سلسلے میں ن م راشد نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

راشد کے اسلوب پر اقبال کے اثرات کے سلسلے میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے جو امثال پیش کی ہیں وہ اُن کے موقف کی مستحکم دلیل ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

i۔ ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز (اقبال)
دل اہرمن سے رہا ہے ستیزہ کار مرا (راشد)

ii۔ جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی (اقبال)
عمر گزری ہے غلامی میں مری
اس سے اب تک مری پرواز میں کوتاہی ہے (راشد)

iii۔ تو خالقِ اعصار و نگارندۂ آنات (اقبال)
وہ خداوند کہ پا بستۂ آنات نہ ہو (راشد)

iv۔ حنا بند عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا (اقبال)
دھل گئے کیسے مگر دستِ حنا بند عروس (راشد)

اقبال اور ن م راشد کی شاعری میں قدر مشترک مسلم زوال کا ایک کردار "مسلا" بھی ہے اور دونوں شعرا کے ہاں اس کا ذکر تواتر سے آیا ہے۔ اسی طرح دونوں اہل فن کے ہاں انحطاط کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ اقبال نے جام و صہبا کو قرار دیا تو راشد نے بھی اُسے مجذوب تک جام لکھا ہے۔

اقبال اور راشد کے مابین مذکورہ فکری قربتوں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر تحسین فراقی نے دونوں با بعض شعرا کے ہاں اختلاف کے بھی بعض پہلوؤں کا ذکر کیا ہے۔ خصوصاً اقبال کے ہاں نظر آنے والا ماضی سے تقدیس کا رشتہ راشد کے ہاں ہدف طنز بنتا ہے۔ اسی طرح دونوں شعرا کے ہاں تصور انسان کے مختلف ہونے کے حوالے سے ڈاکٹر تحسین فراقی نے بہت اہم نکتہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اقبال کا انسان غیر معمولی تخلیقی جوہر رکھنے کے باوجود اپنے آخری تجزیے میں خدا ہی کے آگے سر تسلیم خم کرتا ہے جب کہ راشد کا انسان اپنے غیر معمولی احساسِ عظمت کے باعث "سرکشی سے فرو نہیں ہوتا" کا مصداق ٹھہرتا ہے اور یہ

شاید بیوعزم سے زیادہ اثر پذیری کا نتیجہ ہے۔"(۵۸)

ن م راشد کی شاعری کا خمیر "استعمار دشمنی" سے تشکیل پاتا ہے۔ فرنگی استعمار کے خلاف وہ ایک مضبوط اور توانا آواز ہیں۔ اُن کی نظمیں "زنجیر"، "پہلی کرن"، "سومنات"، "طلسم ازل"، "تیل کے سوداگر" اور "دست ستم گر" ایسی تخلیقات ہیں جن میں راشد اہل ایشیا پر مغربی سامراجیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کے بقول:

> "راشد مغرب کی استعماری روح کو روح شب گرد کہتے ہیں۔ اس ترکیب کی وسعت اور معنی آفرینی قابل داد ہے۔ وہ مغربی استعمار کا ایندھن بننے والے ہندی سپاہیوں کو اسی روح شب گرد کا کنایہ قرار دیتے ہیں۔ دراصل شب گرد اُس پرندے کو کہتے ہیں جو صرف رات کو شکار کرتا ہے اور حشرات کھاتا ہے۔ فارسی میں اسے شب گرک بھی کہتے ہیں۔ مغرب کی استعماری روح بھی رات کی شکاری ہے۔"(۵۹)

"ملا" کے خلاف آواز اُٹھاتے ہوئے ن م راشد کا لہجہ چونکہ قدرے شدید ہو گیا نیز اُن کا طرز اظہار علامتی ہونے کے باعث یہ تصور رائج ہو گیا کہ وہ ملحدانہ فکر رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ راشد ایک خدا پرست شاعر ہیں اور اُن کی شاعری کا مزاج روح دینی سے سرشار ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے راشد کی منظومات میں بعض استعارات اور ایمانیاتی علائم سے جذباتی وابستگی کی بنیاد پر اس نکتے پر بطور خاص بحث کی ہے کہ ایک ایسا شاعر جس کے ہاں شبیہ، اذان اور اس نوع کے خالص دینی الفاظ کی تکرار ہو، وہ ملحد نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ اقبال نے "شکوہ" اور "آتا حشر نے" "شکر یہ یورپ" میں کیا، وہی راشد کے ہاں نظر آتا ہے کہ خدا کی تمام تر عنایات اہل یورپ پر ہیں اور مشرق محروم ہے۔ گویا "مشرق کا خدا کوئی نہیں" ایسا نہیں ہے کہ راشد خدا کی نفی کر رہے ہیں بلکہ یہ اسلوب شکایت ہے۔ بقول ڈاکٹر تحسین فراقی:

> "یہ دراصل پیرایۂ بیان ہے، حقیقت واقعہ نہیں۔ مشرق کی زبوں حالی سے پیدا ہونے والے کرب کی شدت میں اس طرح کے جملے (یا مصرعے) کا اضطراراً سرزد ہو جانا انتہائی قرین قیاس ہے۔ دراصل کسی عہد کی مخصوص ثقافتی صورت حال، معاشرتی اوضاع، معتقدات اور فضا میں مرتعش، معاشروں میں نقب لگانے

والی آواز اس سے بچنا محالات میں سے ہے۔"(۶۹)

اپنے مضمون میں راشد کی نظموں میں لسانی فروگزاشتوں کی جانب بھی توجہ دلائی گئی ہے لیکن مجموعی طور پر ڈاکٹر تحسین فراقی راشد کی نادر تشبیہات، اعلیٰ تمثالوں، تازہ ترکیبوں اور زندہ علامتوں کے مداح ہیں لیکن وہ یہ امر افسوس بھی رقم کرتے ہیں کہ اُردو تنقید تفہیم راشد یہ فرض نبھانے کی تاب نہیں رکھتی۔ وہ یہ سوال اُٹھاتے ہیں:

"کیا ہماری معاصر، ریزہ کار انتقادی صورت حال راشد جیسے اہم اور پہلودار شاعری تفہیمی اور تجزیاتی حیات تازہ کا فریضہ بجا لا سکے گی۔"(۷۰)

"حسن کوزہ گر" میں ن م راشد سے کیے گئے تین نایاب مصاحبے شامل ہیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے:

i۔ "شاعری شوریدہ از پاکستان"

(سپید و سیاہ، تہران ۱۳۴۷ھ ش/۱۹۶۸ء، مصاحبہ نگار: شاہ رخ ارشاد)

ii۔ "ن م راشد"

(مجلہ فردوسی شمارہ ۹۱۹، ۲۳ تیر ۱۳۴۸ھ ش/جولائی ۱۹۶۹ء، مصاحبہ نگار: منوچہر آتشی)

iii۔ "نیا شیخ پاکستان می گوید"

(سپید و سیاہ، شمارہ ۲۱، ۱۳۴۹ھ ش/۱۹۷۰ء)

مذکورہ بالا مصاحبوں کا ڈاکٹر تحسین فراقی نے اُردو میں ترجمہ کرنے کے ساتھ ساتھ بعض ضروری حواشی بھی رقم کیے ہیں جبکہ ابتدا میں مصاحبے سے متعلق جامع تعارفی نوٹ بھی لکھا ہے، جس میں مصاحبے کی اہمیت اور راشد کے ارشادات کی روشنی میں اُن کے افتادِ طبع نیز شعری مزاج پر گفتگو کی گئی ہے۔ ضمیمہ جات میں ان مصاحبوں کے فارسی متون کے عکس فراہم کیے گئے ہیں۔

"حسن کوزہ گر" میں راشد کے ۵۰ مکاتیب بنام ڈاکٹر تقی بابری شامل ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے ان خطوط کے ضروری حواشی رقم کیے ہیں۔ یہ خطوط محض ایک نجی دستاویز نہیں ہیں بلکہ ن م راشد کے سلسلے میں بعض اہم معلومات کا ذریعہ بھی۔ بقول ڈاکٹر تحسین فراقی:

"ان خطوں سے پتا چلتا ہے کہ راشد کی بعض نظمیں نہ صرف تقی بابری کے توسط سے فرانسیسی میں ترجمہ ہوئیں بلکہ راشد انھیں فرانسیسی سے فارسی میں ترجمہ کروا کے تہران سے شائع کرنا چاہتے تھے۔ راشد شناسی کے باب میں ایسے تراجم کی

ایران میں اشاعت کا کھوج لگانا ضروری ہے۔ انھی خطوط سے اپنے مجموعہ ہائے کلام کے بارے میں لکھی گئی بعض تحریروں پر بھی راشد کی آرا کا واضح اور دوٹوک اظہار ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ان خطوط سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وہ اچھی اور ندرت کی حامل پنجابی شاعری سے بھی شغف رکھتے تھے گو کہ خود انھوں نے پنجابی میں کچھ نہیں کہا۔ راشد اپنے وطن پاکستان کے بارے میں جن آرزوؤں اور اندیشوں کا اظہار کرتے رہتے تھے وہ ظاہر و باہر ہے۔ زیر نظر خطوں میں بھی ایک آدھ جگہ انھوں نے پاکستان کی زوال آمادہ ملکی اور ثقافتی صورت حال پر ہمیں دعوت فکر دی ہے۔"(۲۹)

ڈاکٹر تحسین فراقی کی ن م راشد شناسی کے سلسلے میں اُن کی مرتب کردہ کتاب "کس دھنک سے مرے رنگ آئے" نہایت اہم ہے۔ اس کے مندرجات کی تفصیل اُن کی تصانیف و تالیف کے باب میں درج کی جا چکی ہے۔

ن م راشد کی تفہیم کے باب میں شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی کے مجلّہ بازیافت کے شمارہ نمبر ۱۶ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو ن م راشد نمبر کے طور پر شائع ہوا اور یہ ڈاکٹر تحسین فراقی کی زیرِ ادارت منظر عام پر آیا۔ اس شمارے میں راشد کے فکر و فن پر ۱۹ مضامین شائع ہوئے جن میں:

"راشد کی استعمار شناسی" (فتح محمد ملک)، "ن۔م۔راشد: تلاش ہیئت اور روایتی اظہاری سانچے" (سعادت سعید)، "ن۔م۔راشد اور نتائج — جدید شاعری" ([illegible] تکمیل)، "ن۔م۔راشد کا تخلیقی قرینہ" (محمد حمید شاہد)، "سوانح راشد کا ایک نادر ماخذ" (رفاقت علی شاہد)، "ن۔م۔راشد کی شاعری اور استعماری صورت حال" (امجد طفیل)، "زندگی سے ڈرتے ہو؟ — تجزیاتی مطالعہ" (اشفاق احمد ورک)، "راشد شناسی اور ڈاکٹر وزیر آغا" (طارق حبیب)، "بے مہری کے کہستانوں میں" (عنبرین منیر)، "مکاتیب راشد بنام م حسن لطیفی" (نسیم عباس احمر)، "ن۔م۔راشد: ماورا سے گماں کا ممکن تک" (محمد فخر الحق نوری)، "ن۔م۔راشد کے دیباچے — چند اشارات" (عزیز ابن الحسن)، "اسرافیل کی موت: تجزیاتی مطالعہ" (ناصر عباس نیر)، "حسن کوزہ

محر۔۔۔ایک جائزہ" (ضیاءالحسن)، "ن۔م۔راشد سے منوچہر آتشی کا مصاحبہ" (تحسین فراقی)، "راشد صاحب" (ضیا محی الدین) شامل ہیں۔

اس شمارے کا اداریہ ڈاکٹر تحسین فراقی کی راشد شناسی کے باب میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تحریر راشد شناسی کے بارے میں اُن کی ایک جامع تحریر ہے۔ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر ذیل میں یہ اداریہ درج کیا جا رہا ہے:

"میرے بھی ہیں کچھ خواب
وہی کشفِ ذات کی آرزو
مجھے دیکھنے دو وہی سحر

خواب، نئی سحر، کشفِ ذات کی آرزو۔۔۔ بس اسی سے عبارت تھی راشد کی شخصیت اور شاعری۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اقبال کے بعد اگر کسی شاعر پر نگاہ ٹھہر کر جم جاتی ہے اور پھر مشکل سے اٹھتی ہے تو وہ راشد اور صرف راشد ہیں۔ فیض، مجید امجد، اختر الایمان یہ سب شاعر بھی طلسم باندھتے ہیں، شاعری کے پردے میں ساحری کرتے ہیں مگر راشد کا رنگِ شاعری ان سب سے الگ ہے۔ اپنے لفظ و معنی کی وحدت میں اعلیٰ درجے کی رنگارنگی کا امین یہ شاعر اردو شاعری کی ایک ایسی منفرد آواز ہے جو دیر تک باطن کے گنبد میں گونجتی اور لہو کی چار دیواری میں تیرتی رہتی ہے۔ معانی و مفاہیم کا وہ تنوع جو ن م راشد کو میسر ہے، ان کے کسی معاصر یا مابعد کے اردو شاعر کو نصیب نہیں ہو سکا۔۔۔ ارباب نقد ایسے کثیر الجہات اور تہ دار شاعر سے بالعموم انصاف نہیں کر پاتے۔ دراصل بالغ نظر اور بلند نگہ شاعر لفظ اور اس کے معانی کی مسلمہ اور متعین حدیں توڑتا ہے۔ انھیں تخیل کی آنچ سے پگھلاتا ہے اور پھر نئے اور لوچ دار سانچے سے اپنے کوزے خود بناتا ہے۔۔۔ نئے لفظ و معنی کی بڑھتی ہوئی یک دلی سے کہنہ روایتوں کے امین ماتھوں پر تیوریاں اور اعصاب میں الجھن پیدا ہوتی ہے۔ کم نظر اور مجرد آثار تنقیدی رویے جنم لیتے ہیں۔ تخیل کے افلاس اور لسانی تہی دامنی کے شکار تو کیا جانیں کہ پیوندِ حرف اور لحنِ شکرف کس مقامِ معنوی سے الہام گیر ہوتے ہیں اور

اس کے معدن اور منبعے کس مثالی عالم میں مخفی ہوتے ہیں؟ انھیں کیا خبر کہ ایک
خلاق ذہن کے مختلف اوقات میں تخلیق کردہ فن پاروں میں کیا پراسرار، پیچیدہ
معنوی ربط ہوتا ہے اور کثرت میں وحدت کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ خود راشد کو
انتقادی اس کمی کا شدت سے احساس تھا۔ تبھی تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے تھے:

انھیں کیا خبر کس دھنک سے مرے رنگ آئے

راشد کی شاعری کا تنوع غیر معمولی ہے۔ یہ شاعری عظمت آدم کی تخریب اور استعماری
دسیسہ کاریوں، جنگی تصورات حیات اور آفاقی تہذیبی رویوں کی شدید نقاد ہے۔
یہ شاعری اپنے دامن میں شاعر کے تصور زماں، تصور وقت، شعور ابدیت، نفسیاتی تہ
داری، روح بے زماں، اساطیری، داستانی اسلوب، تمثالوں کی ندرت، شعر آئندہ
کے خد و خال اور متعدد دیگر رنگوں اور رعنائیوں کو سمیٹے ہوئے ہے اور پھر اس سب
پر مستزاد اس کا بدیع اور نادر اسلوب۔
یہ بات مخفی نہ ہوگی کہ راشد کے اسالیب شعر پر انگریزی کے رومانوی اور مابعد کے
شعرا کے علاوہ ممتاز فرانسیسی شعرا والیری، میلارمے، پرس اور فارسی کے قدیم و جدید
شعرا کے اثرات بڑے گہرے ہیں۔ ان اثرات کا تجزیہ اور نشان دہی معاصر اردو
تنقید پر قرض ہے۔ علاوہ ازیں ان کے اسلوب پر جدید فارسی الفاظ و تراکیب کا رنگ
اس قدر گہرا ہے کہ اس کا تقابلی اور تحقیقی جائزہ ابھی تک راشد شناسی کے حدود سے بارہ
پتھر باہر رہا ہے۔ راشد صدی کے موقع پر اگر اس طرح کے تجزیوں کا آغاز ہو جائے تو
یہ ایک بڑی تنقیدی خدمت ہوگی اور اس سے راشد شناسی کے نئے در وا ہوں گے۔
راشد کی شاعری اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ اس کا مطالعہ اس کی کلیت میں کیا
جائے اور اس کے مدارج اور ارتقائی مراحل کی ایک روشن، بولتی ہوئی، جیتی جاگتی
تصویر بنائی جائے نیز اس کی تہ میں مخفی ان عناصر کا گہرا تجزیہ کیا جائے جن سے
یہ ترکیب پاتی ہے۔ علاوہ ازیں راشد کے نثری آثار کا تجزیہ بھی لازم ہے۔ راشد
کے مقالات، ان کے مصاحبے، مکاتیب اور ان کے تراجم اس بات کے متقاضی
ہیں کہ ان کی تعیین قدر کی جائے۔ اپنی کلیت میں یہ اسی وقت ممکن ہے جب اولاً

ان کی جمع آوری ہو سکے۔ ان امور کی طرف پیش رفت تو ہوئی ہے لیکن اس کی رفتار اور طریق کار بہر حال اطمینان بخش نہیں۔

لاہور کے ایک معروف ادارے نے ۱۹۸۸ء میں راشد کی کلیات بڑے فخر سے شائع کی مگر ستم یہ کیا کہ ان کے مجموعوں میں شامل دیباچے، مقدمے، مصاحبے سب نکال باہر کیے حالاں کہ راشد کی پیچ دار اور بعض مقامات پر مبہم شاعری کی تفہیم میں اور خود ان کے تصورات حیات و شاعری سے آگہی حاصل کرنے میں یہ خاصے معاون ہو سکتے تھے۔ علاوہ ازیں صحت متن کے اعتبار سے بھی یہ کلیات اطمینان بخش نہیں۔ خدا کرے یہ کلیات تدوین کے سائنسی تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر مدون کی جائے اور اس کے ساتھ ساتھ راشد کے الفاظ و تراکیب کا [کی] فرہنگ بھی شائع ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ سوائے چند بہت اچھے تجزیاتی مضامین کے، راشد پر ابھی تک ڈھنگ کا کوئی تنقیدی کام وجود میں نہیں آیا۔ راشد کی سب سے اہم حیثیت ایک شاعر کی ہے۔ کیا ہماری معاصر ریزہ کار، منتشر انتقادی صورت حال راشد جیسے اہم اور پہلو دار شاعر کی تنقیدی اور تجزیاتی حیات تازہ کا فریضہ بجالا سکے گی؟ اس باب میں راشد کی طرح میں بھی زیادہ پرامید نہیں۔

یہ ریزوں کی تہذیب پالیں تو پالیں
حسن کوزہ گر کو کہاں لا سکیں گے!

مگر دنیا بہرحال امید پر قائم ہے!''(۳)

(۳)

بیسویں صدی کی وہ صاحب بصیرت ہستیاں جن کی شناخت متنوع حیثیتوں میں مستحکم ہوئی اُن میں عبدالماجد دریابادی نمایاں اور معتبر ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اُن کی علمی، ادبی اور تہذیبی خدمات کا احاطہ جس جامعیت کے ساتھ کیا، وہ اُن کے حیرت انگیز مطالعے کے ساتھ ساتھ بصیرت اور نکتہ آفریں مزاج کا مظہر ہے۔ عبدالماجد دریابادی کے بارے میں اپنے ایک انٹرویو میں اُن کا تعارف جس اسلوب میں کراتے

ہیں، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اُن کی ہمہ گیر علمی شخصیت سے کس قدر متاثر ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

> "مولانا دریابادی اُردو ادب کی ایسی شخصیت ہیں، جن پر جامعیت کی اصطلاح کا اطلاق ہوتا ہے۔ وہ بیک وقت ایک ادیب، صحافی، نفسیات نگار اور فلسفہ طراز دانشور ہونے کے علاوہ وہ ایک اعلیٰ سوانح نگار، ممتاز مترجم، عالم دین اور مفسر قرآن تھے۔ زبان اور اُس کی رمزوں سے آگاہ وہ ایک ایسے صاحب اسلوب نثر نگار تھے جو اُردو ادب میں ایک مستقل مقام کے حامل ہیں۔۔۔ وہ اُن اکابر میں تھے جنھوں نے برعظیم کے تمام اہم مشاہیر کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ انھوں نے ساری عمر تصنیف و تالیف میں گزاری، وہ بھارت کے مسلمانوں کے لیے ایک دردمند مگر مضبوط پشت پناہ کی حیثیت رکھتے تھے۔"(۲۳)

اسی طرح عبدالماجد دریابادی پر اپنی تصنیف میں بھی اُن کا تعارف ایک خاص والہانہ پن اور مرعوبیت کے احساس کے ساتھ کراتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> "انھوں نے ادب، انشا، فلسفہ، نفسیات، انتقاد، سوانح، سیرت، تفسیر، ترجمہ غرض ایسے علمی، ادبی، سوانحی، سیرتی، تنقیدی اور تفسیری موضوعات پر قلم اُٹھایا جو ہر لکھنے والے کے بس کا روگ نہیں۔ حتیٰ نبرد پیشہ کی طرح ان میدانوں کے لیے بھی کسی مرد مبارز طلب کی ضرورت تھی اور ماجد ایک ایسے ہی فرد فرید تھے۔"(۲۴)

حقیقت یہ ہے کہ عبدالماجد دریابادی پر لکھنا بھی ہر ایک کے بس کا روگ نہیں اور اس موضوع کے احاطے کے لیے بھی کسی مرد مبارز طلب ہی کی ضرورت تھی۔ اُن کی خدمات کا تجزیہ جس علمی اسلوب اور تحقیقی پیمانوں پر کیا گیا ہے، چند ایک مقامات سے قطع نظر ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس ضرورت کی تکمیل میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔

عبدالماجد دریابادی کی علمی، تہذیبی کاوشوں کے احاطے کے سلسلے میں ڈاکٹر تحسین فراقی کی درج ذیل کاوشیں منظر عام پر آچکی ہیں:

i۔ عبدالماجد دریابادی ــــ احوال و آثار

ii۔ سلطان و محمدؐ

iii۔ عبدالماجد دریابادی (کتابیات)

اوّل الذکر تصنیف بنیادی طور پر ڈاکٹر تحسین فراقی کا پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ ہے جو بعد ازاں کتابی صورت میں کئی بار شائع ہوا۔ دوسری کتاب عبدالماجد دریابادی کے مقالات سیرت کا مجموعہ ہے جسے ڈاکٹر تحسین فراقی نے مرتب کیا ہے۔ جبکہ تیسری کاوش ایک مختصر کتابچہ ہے جو عبدالماجد دریابادی سے متعلق کتابیات کی تفصیل پر مشتمل ہے۔ یہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے کتابیاتی پمفلٹوں کے سلسلے کے تحت شائع ہوا۔ ۲۰ صفحات پر مبنی اس کتابچے کا نمبر ۱۰۶ ہے۔

عبدالماجد دریابادی نے ۱۶ مارچ ۱۸۹۲ء میں دریاباد کے ایک علمی اور خوشحال گھرانے میں آنکھ کھولی۔ سیتاپور کے ایک سکول میں تعلیم حاصل کی۔ کالج میں پڑھنے کے لیے آپ لکھنؤ آ گئے۔ ایم اے کرنے علی گڑھ تشریف لے گئے لیکن والد گرامی کے انتقال کے باعث وطن لوٹنا پڑا۔

زمانہ طالب علمی میں بعض فلاسفہ کی کتب پڑھ کر تشکیک و الحاد کی طرف مائل ہو گئے۔ کم و بیش ۱۰ برس تک مذہب سے دور رہے لیکن اکبرالہ آبادی، محمد علی جوہر، سید سلیمان ندوی اور مجھوان والی ایسے اکابر کی ترغیبات علمی کے باعث مذہب کی طرف مراجعت اختیار کی۔

عبدالماجد دریابادی کی تصانیف فکر و موضوع کے لحاظ سے متنوع ہیں۔ جن میں تنقید، ترجمہ، سوانح نگاری، سفرنامہ نگاری، ڈرامہ نگاری، تحقیق، شاعری، صحافت اور شرح و تفسیر شامل ہیں اور مذکورہ موضوعات پر ان کی تصانیف و تالیفات کی تعداد ۷۰ کے قریب ہے۔ عبدالماجد دریابادی کی علمی کاوشوں میں وسعت اور تنوع ضرور ہے لیکن ہر شعبہ علم میں اُن کا کام معیار و مقدار ہر دو لحاظ سے مذکور کا حامل ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے اُن کی جملہ حیثیات پر اپنے خاص اسلوب تحقیق اور انداز نقد کے ساتھ لیا ہے، جس میں بطور خاص اُس تناظر کو مد نظر رکھا ہے جسے کسی بھی صنف سے متعلق اُن کے کام کے جامع جائزے کے لیے وہ ناگزیر خیال رکھتے ہیں۔

وہ ہر صنف یا شعبے سے متعلق عبدالماجد دریابادی کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے اس سے متعلق مباحث کا احاطہ بھی کرتے ہیں اور مختصر ارتقاء پر بھی نظر ڈالتے ہیں۔ اُن کے طور انتقاد میں یہ امر بطور خاص اہم ہے کہ وہ عبدالماجد دریابادی کی جملہ کاوشوں کو معیار کی روشنی میں پرکھتے ہیں اور موضوع کے ساتھ کسی اندھی عقیدت کا شکار نہیں ہوتے بلکہ حقائق کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

''عبدالماجد دریابادی ــــ احوال و آثار'' کو سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور بعض ابواب کی وسعت کے پیش نظر اُن کی مزید فصلیں بنائی گئی ہیں۔ یہاں ہر باب یا فصل کے جائزے سے کہیں بہتر

ہے کہ ڈاکٹر تحسین فراقی کی اُن جامع آرا کا اندراج کیا جائے جو انھوں نے عبدالماجد دریابادی کی مختلف
علمی، ادبی اور تہذیبی حیثیات کے بارے میں دی ہیں۔ ان آرا سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا کہ انھوں
نے اپنے موضوع کا احاطہ کرتے ہوئے کس طرح رفعت یا اُس کی صورت معکوس کا کھوج لگایا ہے اور اس
سلسلے میں اُن کے معیارات نقد کیا رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"تنقید کے ضمن میں ماجد کی صاف گوئی، توازن، وسعت علم اور اسلوب خاص کا
بخوبی اندازہ ہوتا ہے لیکن یہ بات بہر حال صرف نظر کرنے کے قابل نہیں کہ اُن
کی وفات (۱۹۷۷ء) تک اُردو ادب نے کئی کروٹیں لیں۔ جدیدیت اور ترقی
پسندی کے ریلے آئے اور چلے گئے۔ اُردو تنقید نے ساختیاتی اور اسلوبیاتی طرز
کی طرف بھی کسی قدر اعتنا کیا لیکن ماجد نے آنکھ اُٹھا کر بھی ان جدید رویوں کی
جانب نہیں دیکھا۔ ماجد طبعاً روایت کے آدمی تھے اور چونکہ ان کی زندگی کے
آخری چالیس سال تو اسلامیات کے لیے وقف ہو گئے تھے، اس لیے وہ ادب
اور تنقید کی طرف وہ توجہ نہ دے سکے جس کے وہ مستحق تھے۔ بہر حال اس کے
باوجود انھوں نے اُردو تنقید کو جو کچھ دیا، وہ مقدار میں کم ہونے کے باوجود معیار
کے اعتبار سے یقیناً لائق اعتنا ہے۔"(۲۵)

"ماجد کے مختلف تراجم کے محاسن و معائب کا ذکر ہو چکا۔ اس باب میں آخری
ضروری بات یہ ہے کہ ماجد کے ان تراجم سے اُردو کے اسالیب بیان میں کس
قدر اضافہ ہوا ہے؟ جواب یہ ہے کہ یقیناً۔ ماجد نے فلسفہ، نفسیات، دینیات اور
قرآنیات کے ترجمہ و توضیح سے اُردو کے اظہار کے سانچوں کو وسعت دی اور
اس کے رقبے کو وسیع کیا ہے۔ انھوں نے فلسفہ فرہنگ کی کتب اور فلسفۂ تاریخ
پر مبنی فتوحات علمی کا ترجمہ اس دور میں شروع کیا جب ابھی اُردو میں ترجمے کی
کوئی بڑی اور مستحکم روایت وجود میں نہیں آئی تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ
علمی و فلسفیانہ اصطلاحات ابھی خام حالت میں تھیں۔ ماجد نے فلسفہ کی موزوں
اصطلاحات کے لیے یا تو عربی متبادلات کا سہارا لیا یا اپنے پیشرو مترجمین کی بعض
اصطلاحات کو قبول کیا یا پھر اصطلاحات وضع کیں۔ یہ درست ہے کہ ان میں

سے بعض اصطلاحات اُردو کے حریم میں بار نہ پا سکیں، لیکن ان کی سعی اتنی نامشکور بھی نہیں ہوئی۔

ان کے تراجم کے سلسلے میں اہم تر بات یہ ہے کہ انھوں نے اصل کی روح کو کامیابی سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ہے اور اصل روح سے ہماری مراد صرف مفہوم، معانی اور مائیہ ہی نہیں بلکہ اسلوب بھی ہے۔ اصل اسالیب کی قوت اور جوش کو برقرار رکھنا اور پھر "ترجمہ پن" کا شائبہ تک نہ پیدا ہونے دینا کوئی چھوٹا کمال نہیں ہے۔"(۳۶)

"بہر حال، ماجد کی مندرجہ بالا سوانحی کاوشوں پر ان کے بعض غیر معمولی محاسن کے باوجود اصطلاح سوانح نگاری کا اطلاق محض جزواً ہی کیا جا سکتا ہے۔"(۳۷)

"ماجد اعلیٰ اسلامی اقدار کے حامل اور ان پر عامل عالم تھے اس لیے زیر بحث کتاب میں بیشتر اُنھی لوگوں کے خاکے یا ان پر تعزیتی خاکے ہیں جو مسلمان اور اعلیٰ اخلاقی فضائل کے علم بردار تھے، گویا یہ خاکے لکھ کر ایک درجے میں ماجد ترغیب و ترہیب کے لیے اکابر کی مثالیں پیش کر رہے تھے لیکن ایسے کام میں عموماً خطرہ یہ ہوتا ہے کہ اسلوب بیان پر سنجیدگی یا تکلف غالب آ جائے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ماجد نے اس ضمن میں کہیں اپنے قلم کو محض سنجیدگی سے آلودہ نہیں ہونے دیا اور قلندرانہ نگاری کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔"(۳۸)

"جدید ہندوستان میں کیا اُردو ادب نے ماجد سے بڑا عبرت زا قلم کار پیدا کیا ہے؟ ہمارے خیال میں ہرگز نہیں۔ اسی عبرت زائی نے ماجد کے سفرناموں کو ایک نیا لہجہ اور ایک نئی دھار عطا کی ہے۔"(۳۹)

"ماجد اپنے جاننے والوں کو تمام عمر نہ بھول سکے۔ ان کی عزلت گزینی کی تلافی ان کے بے شمار خطوط نے کر دی ہے جو اپنے اندر ان کے علمی، قصصی، ذہنی اور قلبی تموجات کا ایک بہت بڑا سرمایہ لیے بیٹھے ہیں۔"(۴۰)

"شعر گوئی ماجد کے لیے ایک لمحۂ گزراں تھی اور اس لمحۂ گزراں میں انھوں نے چند شعر بہر حال ایسے نکالے، جو ہمارے حافظے کا ساتھ دے سکتے ہیں۔"(۴۱)

"ڈرامے سے ان کی طبعی مناسبت اُن کے انشائی اور فلسفیانہ ادب میں ضرور کھل

ل گئی اور اسلوب کی جادو نگاری کا سبب بنی۔"(۵۲)

"ماجد نے مکتوبات سلیمانی میں شامل ان کے چار سو ایک مکاتیب کو بڑے سلیقے اور تقریباً ۱۳۰۰ حواشی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ اردو کے مکتوباتی ادب میں سید صاحب کے مکتوبات ایک زندہ اضافہ ہیں۔"(۵۳)

"وہ فلسفہ کا آغاز یونان سے کرتے ہیں، لیکن اس فراموش کردہ حقیقت پر نگاہ نہیں کرتے کہ اگرچہ فلسفہ کی تدوین و تنظیم یونان ہی میں ہوئی، لیکن یونانی فلسفہ اپنی اصل میں ایشیائے کوچک کا آیونی فلسفہ تھا اور اس کی پشت پر مصر اور بابل کا علم موجود تھا۔ جب ایرانیوں نے ایشیائے کوچک کو تاخت و تاراج کیا تو آیونیا کے شہری خوف زدہ ہو کر یونان میں پناہ گزین ہو گئے۔ وہ فلسفہ اور سائنس کے اصول اپنے ساتھ لے گئے۔ یہی اصول یونانی فلسفے کا سنگ بنیاد ہیں۔"(۵۴)

"ان فلسفیانہ تحریروں میں ایک بڑی کمی یہ ہے کہ ان میں "مسلم فلسفہ کی تاریخ" سرے سے موجود ہی نہیں اور نہ ہی قدیم ہندوستان کے فلسفہ سے ماجد نے اعتنا کیا ہے، حالانکہ اگر ماجد اس طرف توجہ کرتے تو یقیناً مسلم، ہند اور چینی فلسفہ کے ذکر سے ایشیائی فلسفہ نگاری میں وہ پیشرو کی حیثیت رکھتے۔"(۵۵)

"مجموعاً ماجد کی جملہ فلسفیانہ تحریروں کے مطالعے سے جہاں ہماری بصیرت میں اضافہ ہوا ہے، وہیں چند موضوعات سے اعتنا نہ کرنے کا افسوس بھی، مثلاً اپنی کتابوں میں ماجد نے بعض موضوعات کو چھوا بھی نہیں جیسے خواب اور اس کی علامتیت، اور بعض کو سرسری چھوا ہے مثلاً ابنارمل سائیکالوجی وغیرہ۔"(۵۶)

"ماجد کے تفسیری کارنامے اسلامیات کے ضمن میں ان کے ایسے سنگ ہائے میل ہیں جن سے کوئی سالک راہ شریعت بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ ان میں ماجد کی تحقیق، تفتیش، تفحص، ان تھک ریاضت، اجتہاد فکر و نظر، حکمت و نکتہ آفرینی، سہولت اظہار اور ادبی محاسن خوب خوب جلوہ گر ہوئے ہیں اور اس نئے دور میں جو عقلی علوم کے ساتھ ساتھ تجربی علوم اور سائنس کا دور ہے اور جس کے نئے نئے انکشافات نے قرآن مجید کی تفسیر جدید کا تحسن اور ناگزیر تقاضا پیدا کر دیا تھا، ماجد کو اس چیلنج کے

قبول کرنے پر مجبور کیا اور انھوں نے تفسیر کے ذریعے قرآنی اشکالات کو دور کیا اور قاری اور قرآن کے درمیان ایک جاندار رشتے کا کام انجام دیا۔"(۵۵)

"باون برس کی صحافیانہ خدمات ماجد کا وہ طغرائے امتیاز ہیں کہ تنہا یہی کوئی کم اعزاز نہیں، یعنی نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں۔ چہ جائیکہ اس صحافت کے ذریعے سے فکر فرزانگی، حکمت و دانش، سوز و سرور اور جذب و جنوں کی کتنی ہی نئی حکایتیں رقم کی جائیں۔"(۵۶)

"ماجد کے اسلوب کی انفرادیت کا راز اُن کی شخصیت، علم اور احساس کی انفرادیت میں مضمر ہے۔ انھوں نے اکیلے اُردو نثر کو کتنے ہی اسالیب دیے ہیں۔۔۔ ماجد نے جس زمانے میں اپنے ادبی کیریئر کا آغاز کیا، متحدہ ہندوستان میں ادا کا بڑا اپنے اسلوب کا سکہ بٹھا چکے تھے یا کم از کم بٹھا رہے تھے۔ ماجد کی شخصیت کی انفرادیت نے ان دونوں حضرات یعنی ابوالکلام اور اقبال سے اثرات ضرور قبول کیے، لیکن ان کا ضمیمہ کبھی نہ بنے۔ ان کے اسلوب پر ان کی اپنی متنوع علمی اور ادبی شخصیت کی چھاپ ہے۔ وہ اپنے اسلوب کے بانی بھی خود ہیں اور خاتم بھی خود۔"(۵۷)

عبدالماجد دریابادی کی علمی حیثیت کی متنوع جہات ہیں۔ وہ ذہنی طور پر اگرچہ کچھ عرصہ مذہب سے دور رہے لیکن مراجعت کے بعد ان کے باطن میں ایک بڑا فکری انقلاب رونما ہوا اور آپ نے جہاں تفسیرِ قرآن ایسا عظیم فریضہ انجام دیا، وہاں رسول اکرم صلعم کی سیرت پر نہایت قابلِ قدر، وقیع اور پُرمغز مقالات رقم کیے۔ ان میں سے بعض آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے نشر بھی ہوئے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے مذکورہ مقالات کو "سلطانِ ما محمدؐ" کے عنوان سے مرتب کیا اور بعض ضروری حواشی رقم کرنے کے ساتھ ساتھ ایک جامع پیش لفظ لکھا، جس میں مقالات کی علمی اہمیت کے علاوہ عبدالماجد دریابادی کے مختصر حالات، ذہنی تجربات پر روشنی ڈالی ہے۔ اپنے پیش لفظ میں انھوں نے سیرت کے علمی اور اسلوبی تقاضوں کو بھی جامع انداز میں بیان کیا ہے اور اس تناظر میں عبدالماجد دریابادی کے مقالات کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"سلطانِ ما محمدؐ میں شامل سیرتی مقالات کا بڑا امتیاز جو اسے سیرت کی بیشتر کتابوں سے الگ کرتا ہے اس کا سحر انگیز اسلوب ہے، ایسا اسلوب جسے اسلوبِ ماجدی کہا جا

سکتا ہے۔ اس اسلوب میں ایک ایسی چاشنی، ایسی والہیت اور ایسی سپردگی ہے جو
بہت کم سیرت نگاروں کو میسر آسکی۔ اس جوش و خروش سے مملو اسلوب کی مثال اس
پہاڑی ندی کی سی ہے جو کلکتی سرکتی اُچھلتی اور جھنجھلتی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے اور
جس میں سرجوشیدگی اور تندخوئی باہم آمیخت ہوگئی ہوں۔ اس اسلوب میں ایک ایسا
خطیبانہ جوش ہے جسے منطق اور استدلال کے چھینٹوں نے معتدل اور متوازن بنایا
ہے۔ ابھی پچھلے صفحات میں بتایا جا چکا ہے کہ ماجد پر ارتیاب کا ایک دردناک دور
گزرا۔ وہ ایک مدت تک تشکیک والحاد کے ظلمات کدے میں بھٹکتے اور آبلہ پائی،
سراب گردی اور تشنہ دہنی کے عذاب سہتے رہے۔ لیکن یہ خلا کب تک رہتا۔ ماجد
جان گئے تھے کہ اپنی اصل سے کٹ کر کس عذاب الیم سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ اس
عذاب سے گزرے اور انھیں احساس ہوا کہ ایمان کی دولت ہی وہ ازلی زندگی ہے
جس سے کلکاریاں پھوٹتی ہیں اور خلا بھرتے ہیں۔ ماجد کے اسلوب سیرت نگاری میں
جو والہیت اور جذبے کا وفور ہے اس کا سبب ان کی یہی عارضی سراب گردی ہے۔
بہت کم تحریروں میں سرجوشیدگی اور عقیدت، دلیل اور تجزیہ کاری اور جلال و جمال کا وہ
قران نظر آتا ہے جو ہمیں سیرت کی اس مختصر کتاب میں ملتا ہے۔"(۳۰)

(۵)

کسی بھی وسیع النظر صاحب نقد و تحقیق کے ہاں بعض موضوعات سے ایک خاص دلچسپی موجود ہوتی ہے تاہم یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ خود کو باغِ ادب کے مخصوص اشجار و اثمار کے ذائقوں تک محدود کر لے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کے موضوعاتِ تنقید و تحقیق میں بھی ایک وسعت ہے اور انھوں نے اُردو شاعری کے تین عظیم سخن کاروں غالب، اقبال اور راشد اور سندی تحقیق کے لیے اختیار کیے گئے موضوع عبدالماجد دریابادی کے علاوہ اُردو ادب کے بے شمار موضوعات پر قابلِ قدر مضامین رقم کیے جو مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ مذکورہ مضامین اب تک درج ذیل تنقیدی مجموعوں کی صورت میں منظرِ عام پر آچکے ہیں:

i۔ جستجو (۱۹۸۱ء)

ii۔ معاصر اُردو ادب (۲۰۰۰ء)

iii۔ افادات (۲۰۰۴ء)

iv۔ نکات (۲۰۱۸ء)

ڈاکٹر تحسین فراقی کے موضوعات نقد و تحقیق میں اگرچہ شاعری اور شعرا کا تخلیقی عمل ان کی ترجیحات میں نمایاں نظر آتا ہے تاہم انھوں نے دیگر اصناف سخن یا پیرایہ ہائے اظہار کو بھی مناسب حد تک اہمیت دی ہے۔ اُن کے ہاں تخلیقِ ادب اور اسلوب و فکر سے متعلق نظری مباحث بھی وقعت رکھتے ہیں۔ انھوں نے فکشن کے متنوع مطالعات بھی کیے ہیں اور اُردو مزاح کی مختلف جہتوں پر بھی توجہ کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُن کے ہاں نقد الانتقاد کے حوالے سے بھی بعض اہم مضامین دیکھے جا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کے نظری مباحث کے ضمن میں یہ پہلو لازمی طور پر پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ اُن کا تعلق دائیں بازو کی فکری تحاریک سے ہے اور وہ اسلامی ادب کے نظریے کے علمبردار ہیں۔ تنقید میں انھوں نے اپنی اساس بھی اس نظریے کو بنایا ہے۔

"اُردو ادب میں اسلامی اقدار کی پیشکش کا مسئلہ" اُن کے پہلے تنقیدی مجموعے "جستجو" کا پہلا مضمون ہے۔ حجم کے اعتبار سے اگرچہ یہ ایک مختصر مضمون ہے لیکن اپنی جامعیت کے لحاظ سے ڈاکٹر تحسین فراقی کی جملہ تنقیدی کاوشوں کے باطن میں یہ تحریر گویا نظر آتی ہے۔ اس مضمون میں اُن کا تنقیدی زاویۂ نظر بالکل واضح ہے کہ ادب کو وسیلۂ خیر ہونا چاہیے اور اسلام پیغامِ خیر ہے لہٰذا ادب کا اسلام آشنا ہونا ضروری ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی اپنے تنقیدی نظریات میں ترقی پسند اہلِ قلم کے ایک بڑے ناقد کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ اُن کا نقطۂ نظر ہے کہ:

> "بیسویں صدی کے تیسرے دہے میں ہمارے اُردو ادیب بھی گھر کے چراغ سے کسبِ نور کرنے کے بجائے چقماق کی تلاش میں مغرب میں جا نکلے۔ بعض نے کریملن کی دیوار کے پیچھے بیٹھ کر" ہوالمارکس "کا ورد کرنا شروع کر دیا۔"[۸۷]

ترقی پسند اہلِ قلم نے اُردو ادب کے فروغ میں جو کردار ادا کیا، وہ کسی سے مخفی نہیں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُردو ادب کی بعض جمالیاتی قدریں ترقی پسند نظریے کے فروغ کے سلسلے میں مجروح ہوئیں۔ دلچسپ امر یہ کہ اسلامی ادب سے وابستہ بعض اہلِ قلم نے بھی ادب کی جمالیات کو انھی ادیبوں کی طرح ضرر پہنچایا کہ جن کو ڈاکٹر تحسین فراقی نے ہدفِ طنز بنایا ہے۔ اسی لیے وہ ادب میں

اسلامی اقدار کی پیشکش کے لیے یہ ضروری خیال کرتے ہیں کہ ادب کو بہر حال تخلیقی جمالیاتی تہذیب کا حامل ہونا چاہیے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ضروری ہے کہ الفاظ و اقدار کے پیوند سے اعلیٰ جمالیاتی ادب تخلیق ہو۔ ایسا ادب جس میں قلم کو کدال اور لوح کو لاؤڈ اسپیکر بنانے کی حرکت کا ارتکاب نہ کیا گیا ہو۔''(۸۲)

ڈاکٹر تحسین فراقی نے اُردو ادب میں اقدار و نبی کے مسئلے کی بحث ہی کو ''اُردو ادب کے چند جدید رجحانات'' میں توسیع دی ہے جس میں وہ ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق کے ساتھ ساتھ ۱۹۶۰ء کے اوائل میں شروع ہونے والی جدیدیت کی تحریک سے ناخوش و بیزار دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کے خیال میں ان تحریکوں کا خمیر مغرب سے اٹھا تھا:

> ''مستثنیات کو چھوڑ کر ہمارے جدید ادب کی حیثیت کمال اتاترک کے اُس جدید سیاسی نظام سے مختلف نہیں جو در اصل مغرب کا پس خوردہ تھا۔ ہمارا جدید ادب بیشتر ترجمۂ افرنگ ہے۔''(۸۳)

اس تناظر میں ڈاکٹر تحسین فراقی کے لیے بعض ایسے اہل قلم اطمینان قلب کا باعث ہیں جنھوں نے روایت کو اپنے اندر سمو کر ادب کو نئے ذائقے عطا کیے۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں سامنے آنے والے بعض شعرا خصوصاً محمد اظہار الحق، سراج منیر، جعفر بلوچ، احمد جاوید، شوکت ہاشمی، عمیق حنفی اور عرفان صدیقی کے بہت مداح ہیں۔ اُن کے نزدیک یہ وہ شعرا ہیں جن کے یہاں:

> ''مسلم تہذیب اور اس کے مظاہر و مراکز سے ایک گہرے جذباتی ربط و ضبط اور بعض داستانی علائم کے شعور کا ایمان افروز احساس ہوتا ہے۔''(۸۴)

ڈاکٹر تحسین فراقی نے جن شعرا کا ذکر کیا ہے۔ وہ یقیناً زرخیز فکر اور شاداب اسلوب کے حامل ہیں لیکن سوال یہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ جدید ادب میں اسلامی ادب کے فروغ میں کوشاں اہل قلم کے بڑے کارواں میں یہ چند نام بھی کیا مستثنیات نہیں؟

اس سے قبل کہ ڈاکٹر تحسین فراقی کے شعری مطالعات کا جائزہ لیا جائے، اُن کی بعض اُن تحریروں کا اجمالی جائزہ لے لینا چاہیے جو نقد الانتقاد کی ذیل میں آتی ہیں۔ اس سلسلے میں غالب شناسی اور اقبال شناسی سے متعلق اُردو تنقید پر اُن کے خیالات نقد کا جائزہ پہلے لیا جا چکا ہے۔ یہاں اس حوالے سے اُن کی

بعض دیگر تحریریں توجہ چاہتی ہیں جو اُردو تنقید اور بعض اہم ناقدین پر انھوں نے رقم کی ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے "نقد تنقید" کی ذیل میں جو اہم مضامین رقم کیے ہیں اُن میں درج ذیل قابل ذکر ہیں:

i۔ اُردو تنقید کے دس سال

ii۔ محمد حسن عسکری اور جدیدیت

iii۔ سلیم احمد کی تنقید نگاری

"اُردو تنقید کے دس سال" ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۹ء کے دوران میں سامنے آنے والی تنقیدی کاوشوں کے جائزے پر مشتمل ہے لیکن اپنے مواد اور مزاج کے لحاظ سے اُردو تنقید کے مجموعی رجحانات اور اہل نقد کے رویوں کے گہرے مطالعے کا آئینہ دار ہے۔ یہ مضمون رقم کرنے اور خصوصاً مذکورہ دس سال کے انتخاب کے سوال پر ڈاکٹر تحسین فراقی لکھتے ہیں:

> "یہ سوال بھی جنم لیتا ہے کہ کیا دس سال کا قلیل عرصہ نئے ادبی/تنقیدی رجحانات کی تشکیل و تکوین کے لیے کافی ہوتا ہے اور اس سلسلے کا تانا بانا آخری سوال یہ ہو سکتا ہے کہ کیا یہ جائزہ واقعی سختی سے دس سال ہی کے عرصے کو محیط ہوگا اور کیا ایسا کرنا تنقید نگار کے لیے ممکن بھی ہوگا؟ یہ آخری سوال اس لیے اُٹھایا گیا ہے کہ تنقید کی تدریج تو یقیناً ہوتی ہے لیکن اس تدریج کو خانوں میں نہیں بانٹا جا سکتا اور یہ حکم تو ذرا مشکل ہی سے لگایا جا سکتا ہے کہ فلاں فلاں رجحانات خاص انھی دس برسوں کی پیداوار ہیں۔ یہ اس لیے کہ رجحانات اور رویے بعض اوقات غیر محسوس طور پر اندر ہی اندر پرورش پاتے رہتے ہیں اور پھر جب اچانک منصۂ شہود پر آتے ہیں تو ان کی دھمک اس شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ کان کے پردے اور دماغ کے خلیے سنسنا جاتے ہیں چنانچہ انھیں بالکل نئے رجحانات سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ رجحانات اپنے عقب میں اور اپنی تعمیر میں بے شمار روایتوں کے انجذابی اور تعاملی نظام ناموں کو سموئے ہوئے ہوتے ہیں۔" (۸۵)

"اُردو تنقید کے دس سال" میں غالب اور اقبال پر تنقیدی کاوشوں سے متعلق حصوں کا جائزہ ڈاکٹر تحسین فراقی کی غالب شناسی اور اقبال شناسی کے باب میں ہو چکا ہے۔ فی الاصل یہ ایک مفصل اور جامع محاکمہ ہے۔

جس کی ابتدا میں اُن تحاریک، رجحانات پر نظر کی گئی ہے جن کا نقطۂ عروج ۱۹۴۷ء تک رہا اور اُن کے اثرات کسی نہ کسی نوع میں آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں بطورِ خاص ترقی پسند تحریک، جدیدیت اور پاکستانی ادب سے متعلق مباحث پر اختصاریات کی گئی ہے تا کہ موضوعِ بحث دہائی کی تنقید کا تناظر سمجھا جا سکے۔

جن ترقی پسند ناقدین کی کتب کا جائزہ اس مضمون میں لیا گیا ہے اُن میں "تعصبات" (فتح محمد ملک)، "توازن" (محمد علی صدیقی)، "ادب اور حقیقت" (انجم اعظمی)، "قصہ نئی شاعری کا" (احمد ہمدانی) اور "امکانات" (عارف عبدالمتین) شامل ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی اگرچہ ترقی پسند تحریک، اس سے وابستہ رجحانات اور اہلِ قلم کے سلسلے میں سخت گیر واقع ہوئے ہیں تاہم اس مضمون میں اُن کی گفتگو میں توازن نمایاں ہے اور وہ مذکورہ ناقدین کے ہاں بعض مستحسن رجحانات کو بھی سامنے لاتے ہیں۔ مثلاً فتح محمد ملک کو وہ ایک معتدل نقاد خیال کرتے ہیں۔ اسی طرح محمد علی صدیقی کے ہاں مطالعے کے فقدان کے باوجود یہ اعتراف کرتے ہیں کہ:

"صدیقی کی کتاب میں تنوع ہے۔ مطالعے کی وسعت ہے اور اُن کی تنقید بولتی ہے کہ میں جدید علوم سے مزین ہوں۔"(۸۹)

مذکورہ توازن اور اعتراضات کے باوجود ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے ترقی پسند ناقدین کے افکار پر گرفت نہ کی ہو اور روا روی یا رواداری سے کام چلایا ہو۔ مثلاً عارف عبدالمتین کی تنقید میں جدلیاتی روش کی تحسین کے باوجود اُن کے بعض گمراہ کن خیالات کی گرفت یوں کرتے ہیں:

"مارکس کی جدلیاتی آویزش نے ان کو اتنی شدت سے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے کہ وہ حضور اکرم ﷺ اور ان کے پیروؤں پر ہونے والے ● تشدد کو بھی" آپ ﷺ اور آپ کے پیروکاروں کی عوامی مفادات کی علم برداری" کا ردِعمل قرار دیتے ہیں اور یوں عرب کو بھی طبقاتی آویزش کی رزم گاہ بنا کر اور حضور ﷺ کو ایک عوامی لیڈر قرار دے کر عارف صاحب نے مارکس اور محمد ﷺ کو شاید ایک ہی سطح پر دیکھا ہے۔ شاید اس اشتراکی کلیہ بازی ہی کا دوسرا نام سائنٹفک حقیقت نگاری ہے۔ جس شخص نے ادب کے سلسلے میں مارکس، لینن، ماؤزے تنگ، لوکاچ، مارکسی اور گورکی کے خیالات پڑھے ہیں اس کو "امکانات" کے اکثر مندرجات ایک لاطائل تکرار کے علاوہ اور کچھ نہیں دیتے۔"(۹۰)

ڈاکٹر وزیر آغا معاصر اُردو تنقید کا ایک بڑا نام ہیں۔ خصوصاً انسان کے تہذیبی سوتوں کی تلاش کے سلسلے میں اُن کے افکار معنی خیز ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی معترف ہیں کہ آغا صاحب نے اُردو تنقید کے اُفق کو وسیع کیا ہے لیکن وہ اس امر کے شاکی ہیں کہ ڈاکٹر وزیر آغا کے ہاں ہندو تہذیب کے حوالے سے احساسِ مرعوبیت بہت زیادہ ہے۔ وہ کلچر ہیروؤں سے تہذیبوں کے احیا کروانے پر مصر ہیں لیکن انھیں مسلم تہذیب کا کوئی ہیرو نظر نہیں آتا۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے بہت عمدہ نکتے کی نشان دہی کی ہے لیکن نقدِ تنقید کے اس مرحلے پر وہ مسلم تہذیب کے بعض ہیروؤں کی نشان دہی بھی کر دیتے تو ان کا موقف اور مضبوط ہو جاتا۔

اُردو کے جدید ناقدین میں افتخار جالب، انیس ناگی اور تبسم کاشمیری کے سرمایۂ نقد پر ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنے خیالات کا اظہار اختصاراً کیا ہے۔ مذکورہ ناقدین میں ان کی توجہ کا مرکز بجا طور پر انیس ناگی قرار پائے ہیں۔ اُن کے حوالے سے ڈاکٹر تحسین فراقی نے بہت سے استفہامیے رقم کیے ہیں۔ جن کے باطن میں استفساری نہیں بعض نئے پہلوؤں کی جانب جہت نمائی کی ہے۔

۱۹۷۰ء کے بعد اُردو تنقید میں پاکستانی کلچر کی بحث کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے جن اہم مضامین کا ذکر اور محاکمہ کیا ہے، اُن میں "کلچر کا ارتقا" (حسن فاروقی)، "پاکستان میں احیائے اسلام کا بحران" (اعجاز فاروقی)، "کلچر میں فیض کے اسباب" (ابن الحسن)، "تہذیبی پراگندگی اور ادیب" (سراج منیر) اور "تہذیب کا جن" (سلیم احمد) شامل ہیں۔

مذکورہ مباحث کے اختتام پر ڈاکٹر تحسین فراقی نے عبداللہ ملک کے جریدے "احتساب" میں فیض احمد فیض کے اُس تاریخی سوالنامے پر بات کی ہے جس میں ادیب کی وابستگی کا مسئلہ اُٹھایا گیا تھا۔ اُن کا خیال ہے:

> "فیض صاحب نے بہت اچھی باتیں کہی ہیں۔ کومٹ منٹ واقعی بہت ضروری ہے۔ آخر فیض صاحب کی بھی تو سابقہ عوامی حکومت کے ساتھ کومٹ منٹ تھی اور وہ ثقافتی خدمات انجام دیتے ہوئے: "بول کہ لب آزاد ہیں تیرے" کا درس بھول گئے تھے۔ ۱۹۷۷ء میں انھیں پھر بھولا ہوا سبق یاد آ گیا۔"(۸۸)

مضمون کے آخر میں اُن تنقیدی کتب اور مضامین کا ذکر ہے جو مختلف اصنافِ ادب یا شخصیات پر رقم کی گئی ہیں۔ یہ حصہ تأثراتی ہے اور ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنی بحث کو تأثریت تک ہی محدود رکھا ہے۔
"اُردو تنقید کے دس سال" ڈاکٹر تحسین فراقی کا ایک اہم اور نمائندہ مضمون ہے۔ اس کے مباحث

بہت جامع ہیں اور جو سوالات اٹھائے گئے ہیں اُن میں سے بعض آج بھی جواب طلب ہیں۔ اس مضمون کی ایک بڑی کمزوری انور سدید اور ڈاکٹر سلیم اختر کا مفصل ذکر ہے۔ خصوصاً سلیم اختر کو بہ طور ایک نفسیاتی نقاد کے اس قدر تفصیل سے زیرِ بحث لانا قدرے بے محل سا معلوم ہوتا ہے۔

"اُردو تنقید کے دس سال" میں محمد حسن عسکری اور سلیم احمد کی تنقید پر ڈاکٹر تحسین فراقی کے خیالات نہایت وقیع ہیں۔ خصوصاً حسن عسکری کے بارے میں اُن کے طرزِ تحریر میں عقیدت اور مرعوبیت بھی واضح ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ اُردو تنقید کی بوطیقا جب بھی رقم ہوگی اُس کی اساس میں حسن عسکری کے نظریات و افکار کا آہنگ واضح ہوگا۔ اپنے اس مضمون میں انھوں نے عسکری کی مغرب پر تنقید پر اپنی توجہ مرتکز کی ہے۔ اُن کا خیال ہے:

> "عسکری صاحب رینے گینوں (عبدالواحد یحییٰ) کی دسیوں بصیرت افروز کتب کے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ مغرب گذشتہ چھے سو سال سے گمراہیوں میں مبتلا ہے جو رفتہ رفتہ بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔ یہی گمراہیاں خود مشرق کی روایت میں بھی شامل ہو کر مشرقیوں کے لیے ذہنی کرب اور روحانی عذاب کا باعث بنی ہوئی ہیں۔"(۸۹)

سلیم احمد کی تنقید بعض حوالوں سے محمد حسن عسکری کے افکار کی توسیع ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنے اس مضمون میں سلیم احمد کے پورے آدمی کے تصور کو گورکی، سارتر اور والٹر پیٹر کے تصورات کے تناظر میں دیکھا ہے تاہم جدید نظم پر اس تصور کی اطلاقی صورت کو روحانیت کی گم شدگی سے تعبیر کیا ہے۔ اُن کی کتاب "ادھوری جدیدیت" کے مختصر جائزے میں اُن کے طرزِ نقد کے بارے میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے بعض بڑی پتے کی باتیں کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> "سلیم احمد کی تنقید ہمیں نئے سوالوں سے دوچار کرتی ہے، مسلّمات پر نظرِ ثانی کی دعوت دیتی ہے، کلیشوں کا پردہ چاک کرنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ روایت کی جدید توجیہات کرتی ہے اور اسے ایک صحت مند رویہ گردانتی ہے۔ سلیم احمد کہیں کہیں سنسنی بھی پھیلاتے ہیں۔ کہیں کہیں کلیہ بازی بھی کرتے نظر آتے ہیں، کبھی کبھی دور کی کوڑی بھی لاتے ہیں، مگر ان فروگزاشتوں سے قطع نظر ان کی تنقیدات اُردو ادب میں مستقل اضافہ ہیں۔"(۹۰)

نقدِ تنقید کے سلسلے میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے محمد حسن عسکری اور سلیم احمد کی تنقید پر اس مضمون کے علاوہ بھی بھرپور توجہ کی ہے اور ان کے افکار و خیالات نیز اسلوبِ تنقید پر مستقل مضامین بھی رقم کیے ہیں۔

''محمد حسن عسکری اور جدیدیت'' کے عنوان سے مضمون میں عسکری صاحب کے رقم کردہ وہ کتابچوں بعنوان'' جدیدیت'' پر بحث ہے اور عسکری صاحب کے مزاجِ نقد اور ذہنی ارتقا کی تفہیم میں بہت معاون ہے۔ محمد حسن عسکری فرانسیسی مفکر رینے گینوں کے تصورِ روایت کے مؤید اور مغربی افکار سے پھیلنے والی گمراہیوں کے شاکی اور ناقد تھے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی عسکری کے تصورِ روایت کی وضاحت کرتے ہوئے ادیانِ مشرق کی سینہ بہ سینہ روایت کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''عسکری نے کہا ہے کہ صرف اسلام ہی نہیں بلکہ مشرق کے سارے ادیان کا انحصار زیادہ تر زبانی روایت پر ہے، لکھی ہوئی کتابوں پر نہیں۔ ہمارے نزدیک کسی دین کے زندہ ہونے کا معیار یہ ہے کہ روایت شروع سے لے کر آج تک کلی حیثیت سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی چلی آئی ہو۔ پچھلے چھ سو سال یا کم سے کم چار سو سال سے یورپ اس تصور کو بھول چکا ہے۔ آج یورپ میں کسی قسم کی بھی کوئی روایت ایسی باقی نہیں جو سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہو۔ یورپ اس قسم کی روایت کو قابلِ استناد بھی نہیں سمجھتا اور صرف ایسی شہادتوں کو قبول کرتا ہے جو تحریری شکل میں موجود ہوں۔''(۲۰)

عہدِ یونان سے عصرِ حاضر تک مغرب کے مختلف ادوار کو دیکھتے ہوئے عسکری صاحب نے فن کے میلانات کی نشان دہی کی ہے۔ وہ ازمنۂ وسطیٰ کے بارے میں اس عام تاثر کی نفی کرتے ہیں کہ وہ دورِ ظلمات تھا۔ اُن کے نزدیک یہ تاثر عقل پرستوں نے پھیلایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ احترامِ انسانی جس قدر اس عہد میں تھا وہ مغربی معاشرے میں کبھی نہیں رہا۔ ڈاکٹر تحسین فراقی عسکری کے اس نقطۂ نظر کی تائید کرتے ہوئے اس امر پر افسوس کرتے ہیں کہ ہمارے بڑے بڑے علماء عہدِ ظلمات والے پروپیگنڈے کے زیرِ اثر ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''عہدِ وسطیٰ کے بارے میں عسکری کی تحقیق بجا مگر اس کا کیا کیا جائے کہ عہدِ ظلمات والے پروپیگنڈے کا اثر ہمارے بڑے بڑے علماء نے بھی قبول کر لیا ہے۔ چنانچہ ممتاز عالم ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط

المسلمین" میں اس عہد کو عہدِ ظلمات ثابت کرنے کے لیے جو دلائل اور شواہد مہیا
کیے ہیں وہ ڈریپر، سارٹن، لیکی اور رسل کے شواہد سے قطعاً مختلف نہیں!"[۴۲]

عسکری صاحب نے اقبال کا نام نہ لیتے ہوئے اُن کے بعض افکار سے انحراف کیا ہے۔ خصوصاً برگساں کے زیرِ اثر اُن کے نظریۂ جوششِ حیات کو انھوں نے گمراہ کن قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کے نظریۂ زماں سے بھی انھوں نے اختلاف کیا ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے ان اختلافات پر کوئی بحث کرنے سے گریز کیا اور محض نشان دہی کی ہے۔ نیز اس تشکیک کا بھی اظہار کیا ہے کہ عسکری کے اس نوع کے خیالات کو پڑھنے کے بعد ان کا کوئی ایسا واضح تصور نہیں ملتا ہے کہ اب آگے بڑھنے کے لیے لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کا یہ مضمون اپنے باطن میں نہایت اہم مباحث کو سمیٹے ہوئے ہے لیکن اختتام قدرے جذباتی نوعیت کا ہے۔ بالفاظ دیگر عسکری نے جس طرح گمراہیوں کا ذکر کرنے کے بعد "پس چہ باید کرد" کا جواب نہیں دیا تو ڈاکٹر تحسین فراقی نے بھی عسکری کے مرشدین یعنی گینوں اور مولانا اشرف علی تھانوی کے معترض ⊙ کے بارے میں اتنا ہی کہنا کافی خیال کیا ہے کہ:

"رہا معترض ⊙ کی جانب سے گینوں کو "بے مغز مفکر" یا اشرف علی تھانوی کو "نہایت ہی معمولی درجے" قرار دینے کا سوال تو ان حضرات سے صرف اتنا پوچھا جا سکتا ہے کہ گینوں یا اشرف علی تھانوی کی کتابیں پڑھنا تو ایک طرف آپ نے ان کی کتابوں کے ٹائٹل بھی دیکھے ہیں یا۔۔۔۔۔؟"[۴۳]

نقدِ تنقید کے سلسلے میں "سلیم احمد کی تنقید نگاری" کے عنوان سے ڈاکٹر تحسین فراقی کا مضمون بھی جامع اور گہرے نکتوں پر مشتمل ہے جس میں سلیم احمد کی تمام تر تصانیف میں پیش کردہ افکار کی روشنی میں مفصل اور مدلل بحث کی گئی ہے۔ آغاز میں سلیم احمد کے تصورات نقد کا جائزہ لینے کے لیے ان کے مضامین سے بعض اہم اقتباسات زمانی ترتیب سے درج کیے گئے ہیں۔ چونکہ سلیم احمد عسکری کی نظریات سے متاثر ہیں اور انھیں اپنا مرشد تسلیم کرتے ہیں لہٰذا مضمون میں دونوں اہلِ نقد کے ہاں بعض مشترک افکار کا بھی اجمالی جائزہ لیا گیا ہے لیکن آگے چل کر ان نکات کی مفصل وضاحت کی گئی ہے جن کی بنیاد پر اُردو تنقید میں سلیم احمد کا خا⊙ اچھا حصہ نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کے نزدیک سلیم احمد کی تنقید کا بنیادی نکتہ کلیت کی تلاش ہے اور یہی وہ جستجو ہے، جس کی بنیاد پر وہ اُردو شاعری میں پورے انسان کا تصور پیش کرتے ہیں۔ پورے آدمی کے تصور کے

سلسلے میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنے مضمون "اُردو تنقید کے دس سال" کے بعض نکات یہاں دہراتے ہوئے بحث کو آگے بڑھایا ہے اور سلیم احمد کے پورے آدمی کے تصور کا مشرق فکری حوالوں سے تجزیہ کیا ہے۔ "پورے آدمی" کے تصور پر سلیم احمد نے اپنے معرکہ آرا مضمون "نئی نظم اور پورا آدمی" میں تفصیل سے بات کرتے ہوئے معاصر اُردو شعرا کے ہاں کسری آدمی کے تصور پر طنز کیا ہے، لیکن پورے آدمی کی جستجو خود انھوں نے جن نکات کی بنیاد پر کی ہے، وہ بھی محلِ نظر ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے سلیم احمد کے ہاں آدمی کی تکمیلیت بہ وسیلۂ جنس پر گرفت کی ہے اور اس حوالے سے فرائیڈ سے شدید اثر قبول کرنے کو اُن کی کمزوری قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "جنس اور جنسیات کے باب میں جو رویہ سلیم احمد نے "نئی نظم اور پورا آدمی" میں اپنایا وہی کم و بیش آخر تک قائم رہا۔ یہ نظریہ انھوں نے جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، فرائیڈ سے شدید اثر پذیری کے باعث اپنایا اور اس ضمن میں فرائیڈ کے نظریۂ تحلیلِ نفسی کے ذریعے ادبا اور شعرا کے کلام اور ان کی ذات و شخصیت کا تجزیہ کیا۔ اس تجزیہ کاری میں سلیم احمد نے کہیں کہیں تو کمال کی نکتہ آفرینی کی اور کہیں کہیں ٹھوکریں بھی کھائیں۔۔۔ سلیم احمد کی یہی نظریہ سازی جہاں اُن کی قوت بنتی ہے وہیں یہ ان کی سب سے بڑی کمزوری بھی ہے۔ ارسطو نے کس قدر درست کہا تھا کہ تعمیم، تخصیص سے آزاد ہو جائے تو اصول سازی خطرناک چیز بن جاتی ہے۔ اس ضمن میں سلیم احمد کا طریق کار اکثر مجھے استخراجی نظر آتا ہے، استقرائی نہیں۔ لگتا ہے کہ وہ بعض اوقات کلیہ پہلے مرتب کرتے ہیں اور اس کے اطلاقات کی فکر بعد میں کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے معمول (ادیب یا شاعر) کے یہاں سے ایسے عناصر کا انتخاب کر لیتے ہیں جو ان کے کلیے کی تصدیق کر سکیں، اور ایسے عناصر سے عمداً یا غیر شعوری طور پر اعتنا نہیں کرتے جو ان کے نظریے سے مطابقت نہیں رکھتے۔ یہیں آ کر ان کی تنقید میں ناہمواری اور یک رخا پن پیدا ہو جاتا ہے۔"(۴۳)

سلیم احمد کی تنقید کا ایک موضوع غالب اور اقبال ایسے عظیم شعرا بھی ہیں جو ڈاکٹر تحسین فراقی کے نزدیک اُردو شاعری کے امامِ اعظم ہیں۔ "غالب کون؟" اور "اقبال، ایک شاعر" میں انھوں نے مذکورہ شعرا کی نفسیاتی تجزیے کے ذریعے بعض ارشادات ایسے کیے ہیں جو محلِ نظر ہیں۔ غالب کی انا پر انھوں نے کئی

ایک جہتوں سے بات کی ہے۔ اُن کے نزدیک غالب کا احساسِ کمتری بیشتر اظہارِ برتری کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اس طرح اقبال کے بارے میں اُن کا یہ نقطۂ نظر ہے کہ اُن کی شاعری میں حرکت کا پیغام دراصل اپنی ہی طبعِ سست کا ردِعمل ہے جسے اقبال نے تعمیم کا رنگ دیتے ہوئے اپنی قوم میں دریافت کیا ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کے نزدیک سلیم احمد تمام عمر نظریۂ احساسِ کمتری کے سحر سے باہر نہ نکل سکے اور وہ اس کا اطلاق غالب اور اقبال ایسے شعرا پر بھی کرتے ہیں۔ یہ نفسیاتی طریقۂ کار ثابت کرتا ہے کہ انسان کے جملہ اعلیٰ افعال خود غرضی کی مقلوب صورت ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"اگر انسان کے ہر اعلیٰ فعل اور عمل کے باطن میں احساسِ کمتری ہی کی کارفرمائی کو درست مان لیا جائے تو ایسی صورت میں یہ افعال، خود غرضی ہی کی ایک مقلوب صورت بن کر رہ جاتے ہیں اور ایسی صورت میں کسی بھی روحانی اور مابعد الطبیعیاتی نظام ہائے سے جذبہ افروزی اور اخذِ حکمت کے کوئی معنی نہیں رہ جاتے۔ تحلیلِ نفسی کی بھی سب سے بڑی ٹھوکر ہے کہ نفسیاتی تو عالمِ نفس سے اوپر اٹھنے کی کوشش نہیں کرتا اور اگر کرتا بھی ہے تو ادھورے اور نیم دلانہ انداز میں۔"(۹۸)

سلیم احمد نے اقبال کے مابعد شعرا پر اثرات کی نفی کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہمارے تخلیقی وجدان اقبال سے متاثر نہیں ہیں۔ یقیناً یہ ایک گمراہ کن خیال ہے اور ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس نکتے کی بجا طور پر نفی کی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے بعض شعرا جن میں جگر مراد آبادی بھی شامل ہیں کے کلام سے مثالیں دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ ان پر اقبال کے کتنے گہرے اثرات ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے یہاں بعض اہم شعرا مثلاً راشد، فیض، مجید امجد، منیر نیازی اور بعض دیگر کو لائقِ اعتنا خیال نہ کر کے حیرت کا سامان کیا ہے۔ اگر وہ اُردو نظم کے ان اہم معماروں کا ذکر کرتے تو اُن کا موقف مزید مستحکم ہو سکتا تھا۔ ظاہر ہے ان عظیم فن کاروں کے مقابلے میں ماہر القادری ایسے شعرا کی مثال دلیل کو کمزور کرنے والی بات لگتی ہے۔

سلیم احمد کی تنقید کی ایک بوالعجبی جوش کے بارے میں اُن کے مضامین ہیں، جن میں وہ جوش کی تکنیک پسندی کو مستحسن خیال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے ایک الگ نکتہ اٹھایا ہے کہ:

"اول تو تکنیک کی شاعری جہاں اور جیسی بھی ہو کوئی ایسی قابلِ قدر، یا بڑی شاعری نہیں بنتی کیونکہ شعر کا اصل کمال تو ان تکنیکی روؤں اور مسئلوں سے الجھ جھگڑ کر اصل ایمان تک پہنچ کر ظاہر ہوتا ہے جس کی ایک قوی ترین مثال خود اقبال کی شاعری ہے"(۹۹)

پورے آدمی کے تصور اور غالب، اقبال اور جوش کے بارے میں سلیم احمد کے بعض خیالات سے جزوی اختلافات کے باوجود ڈاکٹر تحسین فراقی اُن کے طرزِ تنقید اور افکار سے متاثر بھی ہیں اور اُن کے لیے حرفِ تحسین بھی رقم کرتے ہیں خصوصاً اسلامی ادب کے سلسلے میں اُن کے بے باکانہ مباحث کی وہ یوں داد دیتے ہیں:

''سلیم احمد کی تنقید کا یہ اہم امتیاز ہے کہ اس میں انھوں نے ادب، انسانی باطن، روح، مذہب، تہذیب، روایت، تصوف یا دوسرے لفظوں میں انفس و آفاق کی وسعتوں کی تفہیم کی مخلصانہ کوشش کی ہے۔ بحیثیت ایک سچے پاکستانی ادیب کے انھوں نے اسلامی ادب اور پاکستانی ادب کے موضوع پر بھی لکھا اور پاکستان جیسی دینی مملکت میں ادب کی حیثیت اور معنویت پر بھی بے باکانہ انداز میں روشنی ڈالی۔''(۹۸)

ڈاکٹر تحسین فراقی کی نقد و تنقید کی کاوشوں میں اُن کے بعض تجزیے بھی قابلِ توجہ ہیں جو انھوں نے شعری تنقید سے متعلق کتب اور جرائد پر رقم کیے ہیں۔ اس سلسلے میں حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں کی ''مقاماتِ مظہری''، ظ انصاری کی ''کانٹوں کی زبان''، مجنوں گورکھپوری کی ''ارمغانِ مجنوں''، عظمت اللہ خان کی ''سریلے بول'' خواجہ محمد زکریا کی کتاب ''اکبر الٰہ آبادی'' اور ''نقوش'' کا میر نمبر ہے۔

عظمت اللہ خاں نے اپنے مجموعۂ کلام ''سریلے بول'' کے دیباچہ میں جس عروضی انقلاب کی تمنا کی تھی اُس کے بارے میں ڈاکٹر تحسین فراقی کی رائے ہے کہ:

''عظمت اللہ خاں اُردو شاعری اور اُردو عروض کی نارسائیوں کے پیشِ نظر موضوعاتی اور ہیئتی دونوں سطحوں پر ایک بڑا انقلاب لانا چاہتے تھے اور چونکہ وہ سمجھتے تھے کہ کسی تہذیب کا ایک بڑا امتیاز اس کے تسلسلِ فکر سے عبارت ہے اس لیے اُردو شاعری میں تسلسل نگاری کی روایت کے لیے عروض میں بنیادی تبدیلی لانا لازم ہے۔ بظاہر یہ موقف بڑا صائب نظر آتا ہے اور اس کے خوشگوار نتائج بھی برآمد ہوئے ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے ان کے یہاں انتہاپسندی ملتی ہے۔ موصوف صرف اُردو غزل ہی کی گردن مارنے کی ترغیب نہیں دیتے بلکہ مثنوی، قصیدہ اور رباعی جیسی اصناف کو بھی دیس نکالا دینے پر اصرار کرتے ہیں اور یہ اصل میں نتیجہ ہے اُردو شاعری کی نفسیات و شعریات کو نہ سمجھنے کا۔''(۹۹)

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی کتاب "اکبر الٰہ آبادی" پر انھوں نے جو تجزیہ رقم کیا ہے اُس میں اکبر شناسی کی روایت کا جائزہ لیتے ہوئے اُن الزامات کا جواب فراہم کیا ہے جو اُن پر مختلف ناقدین کی طرف سے لگائے جاتے رہے۔ اس سلسلے میں بعض مورخین ادب کے ساتھ ساتھ ترقی پسند ناقدین کے ارشادات پر انھوں نے بطور خاص توجہ کی ہے جس کے بعد وہ تجزیے کے خاص حصے کی طرف آئے ہیں اور خواجہ محمد زکریا کی تصنیف کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے مجموعی طور پر پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے اور اکبر شناسی کی روایت میں اسے ایک نیا زاویہ قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے "اکبر الٰہ آبادی" کے مصنف کی بعض نارسائیوں سے صرف نظر کرتے ہوئے مضمون کے آخر میں اُن سے بعض توقعات بھی وابستہ کی ہیں۔

مجلہ "نقوش" کے میر نمبر کا جائزہ بھی ڈاکٹر تحسین فراقی نے کلام میر کے بعض اوصاف اور میر شناسی کی روایت کے تناظر میں کیا ہے۔ انھوں نے اس کے بعض مندرجات کی اہمیت پر پُر مغز گفتگو کی ہے خصوصاً ان کی تحقیقات کو سراہا ہے جو میر شناسی کی روایت میں ایک بڑا اضافہ ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کے نزدیک:

> "میر پر "نقوش" کی حسنِ کردہ بالا تینوں جلدیں اُردو میں تحقیق، تنقید اور تحسین کی وہ طلائی حیثیت ہیں جن پر اُردو کا مجلاتی ادب عرصے تک ناز اں رہے گا۔"(۲۰)

گزشتہ سطور میں جیسا کہ عرض کیا ہے کہ ڈاکٹر تحسین فراقی کے موضوعات نقد و تحقیق میں شعری مطالعات کی حیثیت ترجیحی رہی ہے۔ غالب، اقبال اور راشد سے متعلق اُن کے تفصیلی مباحث اس ترجیح کے آئینہ دار ہیں۔ اُردو شاعری اور اس کے رجحانات فکر انگیز شعرا کے تخصیصی مطالعات اُن کے مجموعۂ نقد "افادات" کی صورت میں شائع ہوئے ہیں لیکن اُن کی کوئی تنقیدی دستاویز ایسی نہیں ہے جس میں شعر سے متعلق مباحث کے لیے صفحات مختص نہ ہوں۔

شعر کی سماجی ضرورت اور عصری صورت حال کے حوالے سے اُن کا مضمون "شعر کا قاتل کون؟" ایک نہایت فکر انگیز تحریر ہے۔ یہ بنیادی طور پر جوزف اپسٹین کے مضمون "Who Killed Poetry" میں چھیڑی گئی بحث کی توسیع اور اس کے اُردو کے شعری ماحول پر اطلاق ہے۔ جوزف اپسٹین نے یہ دعویٰ کیا کہ براؤننگ اور ٹینی سن کے عہد سے سامعین و قارئینِ شعر کم ہونا شروع ہو گئے، جس کی وجہ مشکل اور مبہم اسالیب تھے اور مستقبل قریب میں یہ تعداد مزید کم ہو جائے گی۔ دوسری جانب ڈونلڈ ہال کے مطابق حقیقت حال یہ ہے کہ شعر خوانی کی مسلسل مجالس منعقد ہو رہی ہیں اور جامعات میں ادبی تقریبات

اور کتب کی رونمائیاں جاری ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ شاعری کی عدم قبولیت کا نظریہ غلط ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ شاعری اور شعرا کی مقبولیت ایک زمینی حقیقت تو ہے لیکن اس کے پیچھے جو تہذیبی حادثہ ہوا ہے اُسے سمجھنے کی ضرورت ہے اور وہ یہ ہے کہ سماج میں بڑھتی ہوئی کاروباری اقدار (Corporate Culture) نے تعلیم اور ادب ہر دو کو متاثر کیا ہے۔ گرامر سکولوں میں شعری تربیت اور محسنات شعری کے ذوق کی بیداری ترجیح نہیں رہی۔ چنانچہ آسان شاعری اور مزاحیہ نظمیں وقت کے ساتھ ساتھ مقبول ہو رہی ہیں۔ اس کے برعکس ادب کی عالی اقدار کو کوئی فروغ نہیں مل رہا۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے مضمون کے اختتام پر ایلون کیرنن کی کتاب "ادب کی موت" (The Death of Literature) سے بھی اقتباسات نقل کیے ہیں جن کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ ادب کی موت کے ذمہ دار وہ ناقدین ہیں جو ساختیات اور پس ساختیات کے تصورات نقد کو رواج دے رہے ہیں۔

"شعر کا قاتل کون؟" ڈاکٹر تحسین فراقی کا ایسا مضمون ہے جس میں مغربی ادبی صورت حال کی عکس بندی کے ذریعے اُردو کی شعری فضا کے زوال کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اگرچہ اس بارے میں بحث کو طویل نہیں ہونے دیا گیا۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنے شعری مطالعات میں فارسی اور کلاسیکی اُردو شعرا کے علاوہ معاصر ادبی فضا میں اُن تخلیق کاروں پر زیادہ توجہ کی ہے، جو اُن کے نزدیک ملی، قومی اور تہذیبی رجحانات کے فروغ میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔

"اُردو ادبیات پر نظامی گنجوی کے اثرات" ایک اہم تحقیقی مضمون ہے، جس میں نظامی کے اُردو شاعری پر اثرات کا درج ذیل حوالوں سے جائزہ لیا گیا ہے:

i۔ نظامی کے قصے کا تتبع

ii۔ نظامی کی مثنویوں سے تاثر پذیری

iii۔ نظامی کی تراکیب اور نظام تشبیہات واستعارات کی پیروی یا اُن سے فیض اندوزی

iv۔ مختلف اصناف سخن پر نظامی کے اثرات

مذکورہ اثرات کو جن شعرا کی تخلیقات میں تلاش کیا گیا ہے، اُن میں شیخ عبدالواحد مسکین، گوبند پرشاد فضا، محمد حسین تجلی، مرزا محمد تقی خان ہوس، غلام حیدر گوپاموی، گوکل پرشاد رسا، میر حسن اور اقبال شامل ہیں۔ مذکورہ اثرات کی روشنی میں ڈاکٹر تحسین فراقی بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

> ”فارسی کے اس خدائے سخن کی تاثیر کا دائرہ صرف فارسی نگاروں تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ انھوں نے ترکی، ہندی، پنجابی، کشمیری اور اُردو کو بھی شدید طور پر متاثر کیا۔ اُردو کا نثری ادب بالعموم اور شعری ادب بالخصوص نظامی کا مرہونِ احسان ہے۔“ (ص—)

کلاسیکی اُردو شاعری کے دورِ آخر کے اہم شاعر امیر مینائی کا فارسی کلام بھی اپنے زندہ افکار اور اسالیب کے باعث لائقِ توجہ ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اُن کے فارسی کلام کا خطی نسخہ مرتب کیا اور یہ اہم ادبی فریضہ انجام دیتے ہوئے اُن کے کلام کا نہایت وقیع تجزیہ کیا جس میں اُن کی فکر، انداز سخن اور موضوعات کے ساتھ ساتھ فارسی شعرا سے اثر پذیری کو کئی ایک پہلوؤں سے دیکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

> ”امیر مینائی کے فارسی کلام کے مطالعے سے ان کی شاعری کے جو نمایاں خصائص سامنے آتے ہیں ان میں پہلی اور اساسی بات تو یہی ہے کہ انھیں زبان و بیان پر بڑی قدرت ہے اور ان کا لب ولہجہ اہلِ زبان کا سا ہے۔ زبان و بیان پر یہ قدرت ان کے کلام سے جا بجا جھلکتی ہے۔ بندشوں میں چستی اور بیان میں جوش و حرارت ہے۔ کیفیاتِ حسن اور نشاط نگارہ سے بعض غزلیں شاہدانِ غزالیں کی چشمانِ سرمہ سائی بنا رہی گئیں وہ بھی دکھاتی نظر آتی ہیں۔ شاعرانہ وفور متعدد جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔ رندانہ سرمستی، شوخی اور کیف آفرینی کے مظاہر بھی جا بجا ان غزلوں میں مشہود ہیں۔ کہیں کہیں اندرونی قوافی کے اہتمام سے غزلوں کو مترنم بنایا گیا ہے۔ صنائع بدائع خصوصاً رعایتِ لفظی کا استعمال خلاقانہ ہے۔ معاملاتِ حسن و عشق کے لطیف انداز میں بیان اور نشاط اندوزی کا سر و ساماں ہی نہیں کیا گیا، یہاں عاشق دل باختہ کی بر شتگی اور سوختہ سامانی کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ پھر ان غزلوں میں مضمون آفرینی کا وہ اسلوب بھی کہیں کہیں دکھائی دیتا ہے جسے سبکِ ہندی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو پچھلے پچیس تیس برس سے ایران کے شعری حلقوں میں بھی تیزی سے مقبول ہو رہا ہے۔ برجستگی اور بے ساختہ پن نے بھی امیر کی شاعری کی تاثیر بڑھانے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ تصوف و عرفان اور وحدت الوجودی مضامین بھی ایک کیفیت کے عالم میں

بیان ہوئے ہیں۔ مختصر یہ کہ حافظ کے نشاطیہ و عارفانہ رنگ اور رندانہ سرمستی، بیدل کی معنی آفرینی اور برجستگی، نظیری کی والہیت اور سبک روی اور غالب کی بلند آہنگی نے امیر مینائی کی غزلیات کو ایسا لب ولہجہ عطا کیا ہے جو دیر تک ہمارے باطنی احساسات میں ارتعاش پیدا کرتا رہتا ہے۔ وسعت نگاہ اور آفاقی زاویۂ نظر نے اس شاعری کو ایک اور جہت بخشی ہے۔ امیر مینائی موسیقی کے رموز و اسرار سے بھی آگاہ تھے چنانچہ انھوں نے اپنے کلام میں بھی جا بجا لفظ و صوت کی موسیقیت اور تقارب، اندرونی قوافی (خصوصاً قصائد میں) کا بھی اہتمام کیا ہے۔ اس شاعری میں اگرچہ کہیں کہیں درد و گداز اور احساس محرومی کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں مگر اس کا غالب آہنگ نشاطیہ اور ہمت و حوصلہ مندی کے لہو سے حرارت اندوز ہے اور اس لحاظ سے یہ شاعری بڑی بہجت انگیز ہے۔ علاوہ ازیں امیر نے کہیں کہیں آشوب عصر کو بھی سلیقے سے بیان کیا ہے۔"(۱۲۰)

سودا کے رسالہ "عبرت الغافلین" پر ڈاکٹر تحسین فراقی کا مقالہ شعری رموز سے اُن کی آشنائی اور وابستگی کی دلیل ہے۔ یہ رسالہ وہ عمدہ نثری کارنامہ ہے جو انھوں نے اشرف علی خاں کے تذکرے پر مرزا محمد فاخر مکیں کی تحکمات کی بابت رقم کیا۔ یہ سودا کے تنقیدی شعور پر دلالت کرتا ہے اور اس نوع کے محاکمات میں ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ بقول ڈاکٹر تحسین فراقی:

"سودا کی "عبرۃ الغافلین" دراصل اسی طلائی زنجیر کی ایک خوشنما اور مستحکم کڑی ہے جس میں منیر لاہوری کا "کارنامہ" آرزو کی "تنبیہ الغافلین"، داد سخن اور سراج منیر، محمد حسن کا رسالہ محاکمات الشعراء، فتح علی خان گردیزی کی 'ابطال الباطل' (خان آرزو کے دلائل کا رد) اور صہبائی کی "قول فیصل" جگمگاتی کڑیاں ہیں۔"(۱۲۱)

اُردو شاعری کے مطالعات میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے تہذیبی اور فکری سوالات کو بہت اہمیت دی ہے۔ برطانوی استعمار کے دوران میں اقبال کے شعری کردار پر اُن کے مباحث مفصل ہیں۔ حالی اور اکبر دو ایسے شاعر ہیں جو قومی فکر کے سلسلے میں اقبال کے پیش رو ہیں۔ "افادات" میں مذکورہ دونوں شعرا پر مضامین مختصر مگر جامع ہیں جن میں اس سوال کا جواب تلاش کیا گیا ہے کہ برعظیم کے مسلم تشخص اور فکری آزادی میں ان تخلیق کاروں کا کیا کردار رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"حالی کی نگاہ میں ہندوستان میں مسلم تشخص کا مسئلہ زیادہ اہم رہا لیکن دنیائے اسلام سے بھی ان کو گہری وابستگی تھی۔ چنانچہ وہ سلطنت ترکی کو خطرے میں دیکھتے ہیں تو بے چین اور غضبناک ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح جنگ طرابلس کے موقع پر بھی وہ اپنے جذبات کو اشعار کا روپ عطا کرتے ہیں۔ سلطان عبدالعزیز کے قتل پر حالی نے جو قطعہ لکھا وہ آج بھی ہمارے لیے اور ہماری سرحدی و اندرونی صورت حال کے تناظر میں ایک انتباہ کی حیثیت رکھتا ہے۔"(۱۰۳)

"اکبر نے اپنے منفرد علامتی نظام اور بے مثال تیکھے، کاٹ دار شعری اسلوب کے ذریعے رمز و ایما کے پردے میں حقائق علویہ اور معارف معنوی و حقیقی سے ملت اسلامیہ کو آگاہ کیا۔ اہل اسلام کی فکری بیداری میں ان کا کارنامہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ ان کا کلام قدیم و جدید کی آفاقی آویزش کا آئینہ ہے۔ اکبر قدیم کے علمبردار تھے مگر اسی قدیم کے جو مشرق کے فضائل سے بہرہ ور اور اس کا معتمد تھا۔ سلسلۂ رشد و ہدایت میں یحییٰ سے پہلے یوحنا کا ظہور ہوا۔ برعظیم کی شریعت شعر میں اقبال سے پہلے اکبر کا ظہور ہوا۔ اکبر کے پیغام کی دھیمی لے کو اقبال نے تیکھے اور بلند آہنگ طرز سے ہم رشتہ کر کے بانگ صور اسرافیل ایجاد کی۔ ملت اسلامیہ کا سرنیاز دونوں کے حضور خم ہے۔"(۱۰۴)

ڈاکٹر تحسین فراقی معاصر شعری ادب میں حفیظ جالندھری کو کم و بیش اسی زاویے سے دیکھتے ہیں جس سے انھوں نے حالی اور اکبر کو دیکھا۔ اُن کے خیال میں وہ برعظیم میں مسلم نشاۃ الثانیہ کے نقیب ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"حفیظ ہماری بزرگ نسل کے وہ آخری شاعر تھے جو دم آخر تک ہمرہان سست عناصر کے لیے حدی خوانی کرتے رہے، "لا احب الآفلین" کی رسم کہن تازہ کرتے رہے، ذوق یقیں اور شوق آرزو کا صور پھونکتے رہے۔"(۱۰۵)

معاصر اُردو غزل کے سلسلے میں جہاں انھوں نے شہزاد احمد ایسے اہم شاعر پر ایک وقیع مضمون رقم کیا، وہاں اُن کے قلم سے ماہر القادری پر بھی ایک مفصل مقالہ معرض وجود میں آیا ہے۔ شہزاد احمد کی شاعری کا مطالعہ انھوں نے کئی اہم فکری جہتوں اور اسلوبی پہلوؤں سے لیا ہے۔ اُن کے نزدیک:

"شہزاد کی غزل ان جذبوں اور خیالوں کی مظہر ہے جس سے ایک متنوع اور تہ دار شخصیت کی تصویر ابھرتی ہے۔ وہ جذبوں اور خیالوں کو اس حسن کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ دونوں میں من تو شدم تو من شدی کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ رمزی اور ایمائی اسلوب نے بھی ان کے یہاں متعدد مقامات پر جادو جگایا ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں متعدد اسالیب شعر سلیقے سے برتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں ایک قابل لحاظ تعداد ایسے اشعار کی ہے جو سہل ممتنع کے عمدہ نمونے ہیں۔"(۱۰۲)

ماہر القادری پر ان کا مضمون مفصل ہے جس میں بعض اہم پہلوؤں کی نشان دہی کی گئی ہے لیکن جو بات انھوں نے مضمون کے مقطعے میں کی ہے، وہ یقیناً [illegible] ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اور اب ماہر کی غزل کے سلسلے میں آخری بات، ماہر کا ۱۹۶۰ء کے بعد کی جدید اردو غزل اور ۱۹۷۰ء کے بعد کی جدید ترین غزل سے تقابل کسی طرح بھی جائز نہیں۔ ہاں اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ماہر نے غزل کے روایتی رموز و علائم سے جو کام لیا اس نے انھیں جگر، حسرت اور اصغر کی غزل کے برابر تو کھڑا نہیں کیا مگر ان کی غزل کہیں کہیں اس مقام کو بڑی کامیابی سے چھوتی ہے۔"(۱۰۳)

غزل شناسی کے باب میں ڈاکٹر تحسین فراقی کی اہم ترین تحریر عرفان صدیقی کے بارے میں ہے۔ مجلّہ "سیارہ" لاہور کے شمارہ ۵ میں عرفان صدیقی کے مجموعہ غزل "سات سماوات" ایک انتخاب کے ساتھ ان کا مختصر تنقیدی نوٹ بھی اہم ہے لیکن "عشق آباد" (کلیات عرفان صدیقی) کے دیباچے میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے ان کے کلام کا فکری و فنی جائزہ تجزیاتی تناظر میں لیا ہے اور اس سلسلے میں بعض انتہائی اہم نکات پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے خیال میں ان کے ہاں اسلوب کی ایسی نادرہ کاری ہے کہ اشعار کا انتخاب انتہائی مشکل ہو جاتا ہے اور یہ تخلیق کار کے خود پر اعتماد اور رجائی طرز احساس کا مظہر ہے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

"عرفان کی شاعری میں رفتہ و آئندہ کی نقش گری کے جو تخلیقی منظرنامے مرتب ہوتے ہیں ان کے پس پشت ان کی خاندانی تربیت اور مسلم کلچر کے تحرک اور تہذیب آفرینی کی پوری تاریخ کارفرما نظر آتی ہے۔ ذرا ان کی شاعری کی لفظیات پر غور فرمائیے، ایک تواتر اور تسلسل کے ساتھ یہ اس کے تار و پود میں

> رچی بسی دکھائی دیتی ہے، اس کے رگ و ریشے، اس کے تانے بانے سے جھلکتی نظر آتی ہے۔۔۔۔ اس شاعری میں ایسا رچاؤ ہے کہ اس کی داد دیے بغیر رہا نہیں جا سکتا۔ میرا خیال ہے کہ عرفان صاحب کا دوسرا شعری مجموعہ یعنی "شب درمیاں" وہ سنگ میل ہے جہاں پہنچ کر شاعر کا وہ رنگ خاص متشکل ہو گیا ہے جسے بغیر کسی مبالغے کے صرف اور صرف رنگ عرفان کہا جا سکتا ہے۔ ان کے بعد کے سارے مجموعے اسی رنگ آہنگ کے مظہر ہیں ــــ چشم کشا، حیرت افزا اور وجد آفریں۔ ایک لفظ میں سمونا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ عرفان کی شاعری غیر معمولی ندرت بیان کی حامل ہے۔"(۱۰۷)

اُردو شاعری کے اسالیب میں تلمیحات اور اسطوری روایات کا ایک وسیع سلسلہ ہے اور شعرا نے تاریخ کے کئی ایک کردار، واقعات اور اسطوری روایات کو اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے۔ اس تناظر میں عبدالعزیز خالد کی منظومات میں دیومالائی رموز و علائم کی کثرت نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کا مضمون "دیومالا اور عبدالعزیز خالد" ان علائم کے قفل کے لیے کلید کا کام کرتا ہے۔ یہ کوشش کی گئی ہے کہ ان اسطوری علامتوں کے پردے میں اُن حقائق کو افشا کیا جائے جو منظومات خالد میں معنوی سطح پر چھپی ہیں۔

سندھی شاعر حضرت شاہ لطیف بھٹائی کے شعری رس پر بھی ڈاکٹر تحسین فراقی نے ایک پُر مغز مضمون رقم کیا ہے، جس میں خطہ سندھ کی ثقافتی روایات، صوفیانہ تصورات اور مذہبی روایات کے تناظر میں اُن کی شعری پرتوں کو بصیرت افروز اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں لطیف کی شاعری میں سندھی معاشرت سے وابستہ مرقع کشی کے عنصر پر بہ طور خاص بحث شامل ہے اور لطیف کے شعری پیرائے کے اس اہم پہلو سے بعض امثال بھی پیش کی گئی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ سندھ کی ثقافتی روایات سے وابستہ کرداروں اور پیشوں کے تناظر میں بھی لطیف کی شاعری کو دیکھا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "ان کہانیوں کے علاوہ جنھیں [جنھیں] لطیف نے اپنی شاعری میں جذب کیا ہے، شاعر کا بعض پیشوں کے متعلق تکنیکی علم حیرت انگیز ہے۔ شیکسپیئر کے متعلق جو کچھ کہا جاتا ہے وہ شاہ کے متعلق بھی اتنے ہی یقین سے کہا جا سکتا ہے یعنی یہ کہ محسوس ہوتا ہے کہ شاہ نے ان پیشوں میں تخصیصی مہارت حاصل کی تھی۔ صرف

ایک تجربہ کار ملاح ہی سمندر سے متعلق ایسا ذخیرۂ الفاظ استعمال کر سکتا ہے جیسا
شاہ نے کیا۔ اسے زبان و بیان پر حاکمانہ عبور ہے۔ وہ تاجر، لوہار، جولاہے، ملاح
اور ساربان کی تمثیلات سے کماحقہ آگاہ ہے۔ الغرض سیکڑوں مختلف حکایتوں اور
ہزاروں مختلف طریقوں سے شاہ نے ایک ہی سبق کو دہرایا ہے: حق کی تلاش۔
سچے موتیوں کی تلاش، ایسا رجیسے عاشق صادق کی تلاش۔
یہ سب کچھ اس انداز سے قاری تک پہنچایا گیا ہے کہ ذہن کو حظ ملتا ہے۔ تشبیہ
استعارے اور تمثیل کے روپ میں قاری شاہ کے اس بدیع اسلوب کے باعث
سحر زدہ ہو کر کھنک جاتا ہے۔ شاہ کے اسلوب میں جو موسیقی جاری و ساری ہے
شاہ عملاً بھی اس کا تخیل تھا۔" (۱۰۷)

ڈاکٹر تحسین فراقی کی شعری تنقید میں بعض شعری مجموعوں پر ان کے تجزیات بھی اہم ہیں۔ اس
سلسلے میں نعتیہ مجموعوں "صلوا علیہ و آلہ" (حفیظ تائب)، "بیت" (جعفر بلوچ) کے علاوہ ایرانی
منظومات کے نثری تراجم کے مجموعے "تمھیں تیر اطواف کرتی ہیں" (محسن نکاہی) پر ان کے تنقیدی
تبصرے لائق مطالعہ ہیں۔ مذکورہ کتب پر ان کے بعض تنقیدی جملے تخلیق کاروں کے مافی الضمیر کے لیے
شرح اور تحسین کے اسباب بہم پہنچاتے ہیں۔ مثلاً:

"حضور ﷺ کی ذات گرامی سے وابستگی اور پیروی کے شدید جذبے نے تائب
کی نعت کو ایک عجیب سرمستی سے ہمکنار کر دیا ہے۔ چونکہ ان کی نعت عقیدت
سے کہیں زیادہ جذبۂ عشق و محبت سے پھوٹی ہے، اس لیے اس میں رسمیت نہیں،
واقعیت ہے۔ حضور ﷺ کا محض ذکر اذکار نہیں بلکہ ان کی شخصیت اور سیرت کے
ایک ایک پہلو کی نہایت ذکاوانہ تصویر کشی کی ہے، جس میں محبت کے گوہر شب
تاب جا بجا جھلکتے نظر آتے ہیں۔۔۔۔۔ تائب حضور ﷺ کو صرف حضور ﷺ!
نبی ﷺ کو صرف نبی ﷺ، خواجہ کو صرف خواجہ اور آقا ﷺ کو صرف آقا ﷺ نہیں
کہتے۔ میرے حضور ﷺ میرے نبی ﷺ، میرے خواجہ، میرے آقا ﷺ کہتے ہیں۔
انھیں یا آقا مدد میرا کہہ کر پکارتے ہیں۔ ان کو صدا دیتے ہیں۔" (۱۰۸)

"جعفر بلوچ کے زیر نظر مجموعہ نعت کی کیفیت انگیزی اور گداز آفرینی قابل داد

ہے مستثنیات کو چھوڑ کر ان کی بیشتر نعتوں میں سوز دروں اور سپردگی کا لہو دوڑتا
ہوا محسوس ہوتا ہے اور کہیں کہیں تو داخل و خارج میں پھیلے ہوئے آشوب نے ان
کی نعت میں شہر آشوب کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ تاریخ اسلام اور مطالب
قرآن پر ان کی نظر اطمینان بخش ہے اور نعت کہنے کے لیے جس چشم بینا، گوش
شنوا، نفس پاکیزہ اور قلب روشن کی ضرورت ہے وہ انھیں قدرت کی طرف سے
میسر ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے وجود کے انگ انگ اور روئیں روئیں سے
محبت رسول ﷺ پھوٹی پڑتی ہے۔"(۳۳)

"طواف کرتی ان نظموں کا بھی ایک مقام ہے۔ بہت رفیع اور بڑا قابل قدر۔
لہٰذا ان نظموں کے مترجم معین نظامی ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں
نے جدید ایرانی ذہن کے کئی متنوع، منور اور متحیر گوشوں میں جھانکنے کے لیے
ایک وسیع کھڑکی کے پٹ ہمارے لیے کھول دیے ہیں۔"(۳۴)

ڈاکٹر تحسین فراقی کی تحقیق و تنقید کا بڑا موضوع تو شعر اور اُس کے معاملات ہیں لیکن فکشن کے سلسلے میں بھی اُن کے بعض مطالعات اُن کی ترجیحات کا ایک الگ رخ سامنے لاتے ہیں۔ اُردو افسانے کے بارے میں مجموعی طور پر چند تاثرات و سوالات کے علاوہ انھوں نے انتظار حسین، قرۃ العین حیدر، رحیم گل اور امجد طفیل کے افسانوی ادب میں فکری و فنی رجحانات کے بارے میں بعض نکات پر جامع خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہ مضامین شعری موضوعات پر نقد کی طرح مستقل ہوتے تو ان کے باطن سے ڈاکٹر تحسین فراقی کے زاویہ ہائے نظر دوسرے انداز سے سامنے آتے اور افسانوی ادب کے بارے میں قاری اُن کی فکری گہرائی سے مزید آگاہ ہوتا۔

اُردو افسانے کے بارے میں اُن کا نقطۂ نظر مجموعی منظر نامے کے حوالے سے خوش امیدی کا عنصر رکھتا ہے۔ لیکن تازہ تر عصری صورت حال کے سلسلے میں اُنھیں زوال آمادگی دکھائی دیتی ہے۔ اُن کے خیال میں پچاس سے ستر کی دہائی تک کا زمانہ اُردو افسانے کا عہد زریں ہے جبکہ نئی کھیپ اس بصیرت سے محروم ہے جو اُن سے اگلوں کو حاصل تھی۔ وہ نئے لکھنے والوں کو تجویز کرتے ہیں کہ انھیں:

"بڑے گہرے ادراک اور میر، گوگول اور موپاساں کی سی دردمندی سے معاصر
صورت حال کا جائزہ لے کر اپنے تخلیقی عمل کو سرگرم کرنا ہوگا اور علامتی، ◆ اور

> حقیقت پسندانہ رویوں کے امتزاج کے جلو میں نئی صداقتیں رقم کر رہی ہوں گی۔"(۳۳)

انتظار حسین پر ڈاکٹر تحسین فراقی کا مضمون تفصیلی ہے اور موضوع "بستی" ہے جس کا جائزہ انتظار حسین کی بعض دیگر تحریروں میں موجود افکار و خیالات کے پس منظری مطالعے کے ساتھ لیا گیا ہے۔ اُن کے نزدیک انتظار کے ہاں ایک خاص طرزِ احساس کا تسلسل اور استقلال نظر آتا ہے۔ وہ "یاد" اور "خواب" کے مرکزی استعاروں کے ذریعے ہجرتوں کے اُن تجربات کو باہم مربوط کر دیتے ہیں جو حجاز کی سرزمین سے شروع ہوتی ہیں اور ہندوستان سے پاکستان تک اپنا سفر کرتی ہیں۔ لیکن یہ امر افسوس ہے کہ ہمارے بعض اُردو ناقد انتظار حسین کے اساطیری اور قصصی اسلوب میں رموز و علائم کی تفہیم کے سلسلے میں کج روی کا شکار ہوئے۔

"بستی" کا موضوعاتی مطالعہ کرتے ہوئے ڈاکٹر تحسین فراقی نے اسے ایک ایسا سوانحی ناول قرار دیا ہے، جس کا مرکزی کردار خود مصنف ہے۔ ہجرت کا یہ تجربہ خود انتظار حسین کا ہے اور اس کے بیان میں وہی کیفیت ہے جو رومی کی مثنوی کے ابتدائیے میں ہے۔ کئی ایک مقامات پر فلیش بیک کی تیکنیک استعمال کرتے ہوئے مصنف نے تلازمۂ خیال سے بڑی کامیابی سے کام لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "انتظار حسین نے اس تکنیک کو بڑی کامیابی سے برتا ہے۔ درمیان میں جگہ جگہ وہی حکمت و دانش کی باتیں اور تفرقی یادوں کے دلنشین patches۔ یوں ایک وقت کے بطن میں کئی وقت سانس لیتے دکھائی دیتے ہیں اور چونکہ انتظار کی مسلم تاریخ پر بھی گہری نظر ہے اس لیے بستی میں مماثل واقعات کا قران معد ◆ طرزِ تحریر کے ایک عجیب طرز کا تاثر پیدا کرتا ہے۔"(۳۴)

ڈاکٹر تحسین فراقی نے "بستی" کے مرکزی اور ثانوی ہر دو کرداروں کا جائزہ لیتے ہوئے ذاکر کے کردار میں انتظار حسین جبکہ افضال کے ہاں منیر نیازی کی شخصیت کا پرتو تلاش کیا ہے۔ مضمون کے آخر میں بستی کی ہیئت پر ناقدین کے بعض اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے بعض عالمی فکشن نگاروں کی مثال دیتے ہوئے بہت پتے کی بات کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "انتظار حسین کی بستی سے ناول کی فارم کا مطالبہ کرنے والے نقادوں سے اگر پوچھا جائے کہ صاحب کیا آپ کافکا کو ایک بڑا ناول نگار نہیں مانتے، کیا آپ

کے نزدیک لارنس ایک بڑا ناول نگار نہیں ہے، کیا آپ جوائس کے بڑا ناول نگار
ہونے کی نفی کرتے ہیں اگر نہیں تو پھر انتظار کے اس ناول کو بھی ناول مان لیجیے۔
صرف ناول ہی نہیں ایک بڑا ناول۔ فارم کا یہ مسئلہ انتظار ہی کے یہاں نہیں
لارنس کے یہاں بھی تھا۔"(۲۸)

قرۃ العین حیدر پر مضمون تاثراتی حیثیت رکھتا ہے۔ جو اُن کی وفات پر رقم کیا گیا۔ یہ مختصر تاثر اپنے باطن میں دردمندی کا عنصر رکھتا ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اُن کے تخلیقی سرمائے میں آہنگ اقبال کی جستجو کرتے ہوئے مسلم تہذیب کے عناصر کا بھی سراغ لگایا ہے اور اہل اسلام کی عصری شکست وریخت کے نقوش بھی تلاشے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"اقبال کی طرح عینی بھی کھوئے ہوؤں کی جستجو کرتی ہیں، قرطبہ اور غرناطہ اقبال
ہی کی طرح عینی کے قلب میں بھی زندہ تھے۔ ٹیپو شہید کی عظمت کا نقش، اقبال
ہی طرح ان کے دل میں بھی گہرا تھا۔ اس سب کے پیچھے کہیں نہ کہیں، خفیف
صورت میں مسلم نشاۃ ثانیہ کی آرزو بہر حال ظہور رفیاب کرتی دکھائی دیتی ہے۔
ملت بیضا کی زوال پسندی دونوں کے لیے موجب اذیت تھی۔"(۲۹)

رحیم گل کے ناول "جنت کی تلاش" میں شمالی علاقہ جات کے پہاڑی سفر کی معنویت کو ڈاکٹر تحسین فراقی نے علویت، روح اور عظمت انسانی کی علامت کے تناظر میں دیکھا ہے۔ اُن کے نزدیک ناول کے مرکزی کردار امتل کا یہ کوہستانی سفر تہذیب نفس کا استعارہ ہے۔ وہ اپنے باطن میں سوئے حسن کی بے خوفی کے احساس کو جذب کیے ہوئے ہے اور اپنی پہچان کو اس سے وابستہ کرتی ہے۔ ناول کے بارے میں اپنے مجموعی تاثر کو ڈاکٹر تحسین فراقی نے جن الفاظ میں سمیٹا ہے، وہ ناول کی معنوی کائنات کا ایک جامع عکس سامنے لاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"رحیم گل کا یہ ناول ناولوں کے عمومی عامیانہ پن سے بالکل الگ ہے۔ یہ اس
روحانی بحران اور نفسیاتی کش مکش کا مظہر ہے جو اس دور سے خاص ہے۔ سب
کچھ ہوتے ہوئے کچھ نہ ہونے کا احساس، آدمی پر سے اعتماد اٹھ جانے کا المیہ،
دولت کی ریل پیل ہونے کے باوجود باطنی مفلسی، بظاہر کائنات کا مرکز ہونے
کے باوجود لامرکزی کا احساس، اندر سے کسی چیز کے گم ہو جانے کا کرب اور

بالآخر غرور اور زوال کے اچانک حاصل ہو جانے کی یکی خوشی سے یہ ناول گوندھا
گیا ہے۔"[illegible]

ڈاکٹر تحسین فراقی نے امجد طفیل کے افسانوی مجموعے "اشتہاب شاپ" کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ افسانہ نگاروں کی تازہ دم نسل کے ہاں انھیں بہرحال امید کی ایک کرن ضرور نظر آتی ہے۔ اُن کے نزدیک اشتہاب شاپ میں شامل افسانے:

"خواہش سفر اور سنگین حقائق کے تصادم سے پیدا ہونے والی صورت حال کے
فوٹو بیں یا بہ الفاظ دیگر مثالیت اور خارج میں پھیلی ہوئی عملی صورت حال کے
تصادم کے آئینہ دار ہیں۔"[illegible]

اُردو فکشن پر لکھی جانے والی کتب میں ڈاکٹر سہیل بخاری کی "اُردو داستان" کئی ایک پہلوؤں سے قابلِ ذکر ہے۔ اسد اللہ وجہی کی "سب رس" سے میر احمد علی کی "قصہ بدر المدنی" تک داستانی ادب کے جامع جائزے پر مشتمل اس تنقیدی دستاویز میں قصوں کے اصل ماخذ اور خلاصۂ داستان کے ساتھ ساتھ اُن کے مصنفین کے بارے میں عمدہ آگاہی فراہم ہوتی ہے۔ یہ کتاب داستان شناسی کے سفر میں یقیناً ایک اہم سنگِ میل ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس کتاب کے مذکورہ جملہ مثبت پہلوؤں کو نگاہِ استحسان سے دیکھتے ہوئے مصنف کی تحقیقی ریاضت اور معروضی تنقیدی نقطۂ نظر کو بہت سراہا ہے۔ لیکن اپنے مخصوص اسلوبِ نقد کی پیروی کرتے ہوئے بعض نارسائیوں اور فروگزاشتوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل نکات پر بحث کی گئی ہے:

i۔ فاضل مصنف نے "معراج العاشقین" کو خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی تصنیف قرار دیا ہے جو درست نہیں۔

ii۔ داستان کی علامتی کائنات پر سیر حاصل بحث نہیں کی گئی خصوصاً داستانوی علائم کے مابعد الطبیعیاتی اور متصوفانہ پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

اُردو کے ممتاز افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کی کئی ایک دیگر متنوع جہتیں بھی ہیں۔ فلموں کے سکرپٹ بھی رقم کیے، تراجم بھی کیے، مضامین بھی لکھے اور اس کے ساتھ ساتھ اُن کے قلم سے اپنے عہد کی مختلف شخصیتوں کے خاکے بھی معرضِ تحریر میں آئے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اُن کے موخر الذکر پہلو پر

"شہر میں کھولی ہے منٹو نے دکاں سب سے الگ" کے عنوان سے اپنے مضمون میں اُن کے خاکوں کو بعض ایسی جہتوں سے دیکھا ہے جو منٹو پر لکھی جانے والی تنقید میں زیادہ مقبول نہیں لیکن اہم ضرور ہیں۔ منٹو کے خاکے جو "گنجے فرشتے" اور "لاؤڈ سپیکر" کے عنوان سے منظر عام پر آئے منٹو کی بے باکی اور کاٹ دار اسلوب کے باعث اُردو خاکہ نگاری میں ایک الگ پہچان رکھتے ہیں اور ان کے مطالعے سے بہت سی شخصیات کے ظاہر و باطن کے مابین امتیاز کھل کر سامنے آتا ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے منٹو کے خاکوں میں اُن کے کاٹ دار اسلوب پر جہاں لکھا ہے، وہاں منٹو کی مذہب پسندی، پاکستان اور بانیٔ پاکستان سے غیر متزلزل محبت اور اپنے وطن کے بعض مسائل و حقائق ذہنی کے دردمندانہ احساس کا پہلو بھی اجاگر کیا ہے۔ بابو راؤ پٹیل اور محمد علی جناح کے خاکوں کے حوالے سے انھوں نے منٹو کے مذہبی اور ملی شعور کی پرتیں بہ طور خاص وا کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> "بابو راؤ پٹیل کا بے لاگ خاکہ لکھنے والا منٹو جہاں اس کی تحریروں کا گرویدہ ہے وہیں اسلام کے باب میں اس کے تعصب اور بعض زہر بھری تحریروں پر گرفت بھی کرتا ہے۔ منٹو کو اس امر پر حیرانی ہے کہ بابو راؤ پٹیل جیسا تاریخ کا مطالعہ رکھنے والا کس قدر بے خبر ہے۔ اس خاکے میں آگے چل کر منٹو جو کچھ لکھتے ہیں وہ عالم اسلام کی آج کی صورت حال میں حد درجہ لائق توجہ ہے۔" [illegible]
>
> "منٹو کی خاکہ نگاری کا یہ جائزہ اس وقت تک نامکمل رہے گا جب تک "گنجے فرشتے" کے اولین خاکے "میرا صاحب" سے اعتنا نہیں کیا جائے گا۔ منٹو کے تمام خاکوں میں یہ واحد خاکہ ہے جس کو منٹو کے واحد متکلم کے بجائے قائد اعظم محمد علی جناح کے ڈرائیور محمد حنیف آزاد کے توسط سے استوار کیا گیا ہے۔ منٹو نے "گنجے فرشتے" کی ترتیب میں اس خاکے کو اولیت دے کر دراصل یہی اسطور بتانا چاہا ہے کہ ان کی ترجیحات میں جناح کی شخصیت کیا معنویت رکھتی ہے پورا خاکہ اپنے اندر جناح کی شخصیت کے حوالے سے بعض ایسی نادر معلومات رکھتا ہے جس سے "جناح حیات" کا کوئی طالب علم صرف نظر نہیں کرسکتا۔ جناح کی جیتی جاگتی اور سچی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے اور ان کی نجی زندگی کے بعض کیسے اہم پہلو سامنے آتے ہیں۔" [illegible]

اُردو کے انشائیہ ادب کے سلسلے میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے جن اہلِ قلم کے تخلیقی سرمائے پر تنقیدی توجہ کی ہے، اُن میں مشتاق احمد یوسفی، عطاء الحق قاسمی اور ڈاکٹر یونس بٹ شامل ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی کے انشائیہ اسلوب پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے ان کی نثر میں شعری عناصر اور صنائع بدائع کی تلاش کی ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی مزاح یوسفی پر لکھتے ہوئے اُن سے متاثر ہی نہیں مرعوب بھی دکھائی دیتے ہیں:

"تخلیق کے شبستاں میں روشن یوسفی کے چار چراغ (چراغ تلے، خاکم بدہن، زرگزشت، آبِ گم) ایجاد و ابداع کے چلچراغ ہیں جن کی روشنیاں ایک دوسری کی حریف نہیں، ایک دوسری میں گھل مل کر ایک ہو گئی ہیں۔ سچ ہے کہ روشنی روشنی کا راستہ نہیں روکتی۔ وحدت فی الکثرت کا یہی تخلیقی اور عرفانی مفہوم ہے۔ یوسفی نے اپنی تصانیف میں ظرافت کے حربے استعمال کیے ہیں۔ ان کے یہاں لفظی، واقعاتی اور کرداری طنز و مزاح کی سبھی شکلیں نظر آتی ہیں۔ انھوں نے تقلیب، تحریف، تصرف، تجنیس، رعایت لفظی، غیر متوقع موڑ، مہمل اور بے جوڑ سے معانی کی نئی سطحوں کے ظہور، اور نادر تراکیب سب کو سمجھا اور برتا ہے۔"(۲۳)

یوسف خان کمبل پوش کے سفرنامے تاریخ یوسفی یا عجائبات فرنگ کے مفصل مقدمے میں جہاں اس سفرنامے کے دیگر تہذیبی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے، وہاں اس کے اسلوب کو انیسویں صدی داستانی رنگ کے تناظر میں دیکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"کمبل پوش کا اسلوب وہی ہے جو انیسویں صدی کے پہلے نصف تک اردو نثر کا ہو سکتا تھا۔ ابھی اردو نثر اس قدر ارتقا یافتہ نہ ہوئی تھی کہ داستانی اسلوب، قافیہ پیمائی، ترصیع اور تعقید سے آزاد ہو سکتی۔ چنانچہ کمبل پوش کے یہاں بھی ایسی متعدد صورتیں موجود ہیں۔"(۲۴)

اسی طرح جمیل الدین عالی کے سفرناموں "دنیا مرے آگے" اور "تماشا مرے آگے" پر اُن کے مضمون میں وہ خاص تہذیبی رنگ نمایاں ہے جو اُن کی تنقید کا وصفِ خاص ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کی کائناتِ نقد و تحقیق کے مذکورہ اقتباس کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ فکر و نظر کی جمالیات سے معمور نگارشات کے یہ گوشے اپنے باطن میں کس قدر شاداب ہیں۔ اُردو

تنقید کے نظری مباحث ہوں یا تخلیقی سرمائے پر عملی انتقاد، ڈاکٹر تحسین فراقی کی جستجو سے کئی ایک اہم نکات کا سفر طے ہوا اور افادات کے کئی ایک پہلو سامنے آئے۔

اُردو شاعری کے ائمۂ اعظم غالب اور اقبال کی فکر و فرہنگ پر انھوں نے جامعیت اور وسعت فکر کے ساتھ لکھا۔ عبدالماجد دریابادی ایسی ہمہ جہت شخصیت کے جملہ پہلوؤں کو انھوں نے جس علمی پیرائے میں سمیٹا، لائق تحسین بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔ ن م راشد کی شاعری پر اُن کی تنقید بعض نئے زاویے سامنے لاتی ہے۔

اُردو تنقید کے نظری مباحث اور نقد تنقید کے ذریعے ڈاکٹر تحسین فراقی نے اُردو تنقید میں جہاں اپنے نقطۂ نظر کی شرح کی، وہاں بعض تنقیدی زاویوں پر جامع بحث کر کے اُن مغالطوں کو رد کیا، جن کے راسخ ہونے کا خدشہ تھا۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے شاعری پر تنقید اپنے کلاسیکی مزاج کی روشنی میں کی۔ خصوصاً معاصر شعرا پر انھوں نے قابل قدر مضامین رقم کیے۔ اُردو فکشن کے سلسلے میں اُن کا کام مختصر ہے لیکن بعض تہذیبی مباحث کے تناظر میں انھوں نے جن نکات کو اجاگر کیا ہے وہ اُردو تنقید میں نایاب ہیں۔ یہی صورت حال دیگر اصناف نثر یعنی مزاح اور سفرنامے کی تنقید کی ہے۔

اُردو تنقید میں عمرانی طرز نقد کی اہمیت ابتدا ہی سے رہی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہی وہ اسلوب تنقید ہے جو ہمارے ہاں ایک دبستان کی شکل اختیار کر پایا تو غلط نہ ہوگا۔ جمالیاتی، نفسیاتی یا ساختیاتی مباحث ہمارے ہاں کم ہونے یا کسی پیچیدگی کا شکار ہو گئے۔ ایسا ہونے میں اُردو ناقدین کی اہلیت و استعداد کا بھی سوال موجود ہے لیکن یہاں اس بحث کا محل نہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کے ہاں عمرانی زاویۂ نقد غالب ہے۔ یہ الگ بات کہ اُن کے مزاج میں چونکہ شعری اقدار کا جہان موجود ہے تو وہ ادب کے جمالیاتی پہلوؤں کی جانب بھی توجہ کرتے ہیں۔ اُن کے مضامین میں مقصدیت کا عنصر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ شاعری ہو یا فکشن، اپنی تنقید میں دائیں بازو کی فکری اساس کو مستقل اہمیت دیتے ہیں۔ نیز ترقی پسند افکار و خیالات کو مکمل کر رد کرتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے اُن کے ہاں طنز کا عنصر بھی اُبھرتا ہے۔

عمرانی زاویۂ نظر سے ڈاکٹر تحسین فراقی کی تحریروں میں ارض پاکستان سے جڑت بہت مستحکم نظر آتی ہے۔ وہ اپنی وابستگی بھی انھی اہل دانش سے ظاہر کرتے ہیں جو اس خطے کی نظریاتی اساس کے پاسبان

خیال کیے جاتے ہیں۔

''جستجو'' سے ''نکات'' تک ڈاکٹر تحسین فراقی کی تنقید میں موجود مباحث کے سلسلے میں یہ پہلو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ محمد حسن عسکری کی فکر اور انداز نقد سے بہت متاثر ہیں اور اُن کے طرز تحریر میں عسکری کی تنقید کا آہنگ واضح سنائی دیتا ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کی تنقید میں علمی وسعت بے پناہ ہے۔ وہ کسی فن پارے پر توجہ اُس کے متن کے باطن میں موجود جملہ جہات کو سامنے رکھ کر کرتے ہیں۔

اُن کی گفتگو میں بین الاقوامی ادب کے ساتھ ساتھ عالمی دانش کا عکس بھی واضح نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں عالمی اہل ادب اور صاحبانِ فکر و نظر کے علمی سرمائے کا مطالعہ اُن کی تحریر میں عالمانہ بصیرت پیدا کرتا ہے۔ یہاں مناسب ہوگا کہ اُن کے ''خطبہ صدارت'' سے ایک اقتباس ملاحظہ کیا جائے:

> ''ہر تہذیب اپنے مخصوص تصورِ حقیقت کے تابع اور اس کی مظہر ہوتی ہے۔ مغربی تہذیب کے بارے میں اشپنگلر نے کم و بیش ایک صدی قبل جو بات کہی تھی وہ بہت حد تک آج بھی اتنی ہی سچ ہے، جتنی اس وقت تھی۔ اس نے کہا تھا کہ مغربی تہذیب اپنی نہاد میں فاؤسٹ کے زاویۂ حیات کی تابع ہے یعنی Faustian (فاؤسٹی ان) ہے۔ عہد وسطیٰ کی کئی داستانوں کا ہیرو فاؤسٹ اس لحاظ سے بڑا بدقسمت واقع ہوا کہ اس نے علم اور قوت کے حصول کے لیے ابلیس سے اپنی روح کا سودا کیا۔ اول تو علم کے الوہی منبع سے صرف نظر کرنا اور اسے ابلیس سے طلب کرنا ہی کب صائب تھا، اوپر سے اس نے قوت اور اقتدار کی بھیک بھی مانگ لی اور یہ سب کچھ اس نے اپنی روح کی قیمت پر کیا۔ لہٰذا نتیجہ معلوم۔ اول اول تو اس سے التفات برتا گیا مگر رفتہ رفتہ فاؤسٹ لذات کی دلدل میں پھنستا گیا اور ابلیس نے اسے اس کی حالت پر چھوڑ دیا۔ مغرب کے اس فاؤسٹی مزاج کا تجزیہ کرتے ہوئے ''مغرب کی خودکشی'' کے مصنفین لکھتے ہیں کہ مغربی تہذیب کا مقصود بھی حصولِ قوت ہے اور یہ مسلسل اقداری، ثقافتوں، روایتوں، نظام عقائد، قبل از صنعتی انقلاب طرزِ حیات اور اس سیارے کے ماحولیاتی نظام کو تہس نہس کرنے والا ہے(ص۴۲)۔ اس کے بعد ایک جملہ ایسا

ہے جسے اصل انگریزی زبان ہی میں قوت کرنا مناسب ہوگا۔ لکھتے ہیں:

"They (the Westerners) always want to do something, when often the best thing is to do nothing."(P.22)

جب ہر شے کو چیلنج کرنا اور اس کے وجود کی نفی ہی مطمحِ نظر ٹھہرا اور مقصود تنہائی حصولِ قوت، تو اس کا نتیجہ مثبت اقدارِ حیات اور مسلمات کے رد کے سوا کیا نکلتا۔ مصنف کی موت، تاریخ کا اختتام، مرکز کی نفی، ریاست کا اختتام اور صداقتِ تنہائی کی موت اور اس طرح کے شاخسانے اسی طرزِ فکر سے پھوٹتے نظر آتے ہیں۔" (۳۳)

ڈاکٹر تحسین فراقی کے اسلوب میں علمیت کی گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ اُن کا طرزِ کلام اپنے آہنگ کے لحاظ سے ایک ایسے صاحبِ علم و دانش فرد کا ہے جس کے ہاں مذہب، فلسفہ اور ادب کا امتزاج ہے۔ وہ ادب پارے کو جس زاویے سے دیکھتے ہیں، اُسے ثابت کرنے کے لیے جامع اور مستحکم دلائل سے کام لیتے ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کے ہاں تحقیق کی ہمہ گیریت لائقِ ذکر ہے۔ وہ کسی علمی کام کا جائزہ لیتے ہوئے ایسے اہم نکات کی جانب اشارہ کر دیتے ہیں جو نئے اور نایاب ہوتے ہیں۔ غالب اور اقبال کے سلسلے میں بعض جامع تحقیقی کاموں کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے جن نارسائیوں اور فروگزاشتوں کی تفصیلات بیان کی ہیں، وہ اُن کے وسیع تر مطالعے کی دلیل ہیں۔

وہ اپنا نقطۂ نظر قطعیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں لیکن گفتگو کو یک رنگی سے محفوظ رکھنے کے لیے رمزیت اور شعریت کو بھی کام میں لاتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ محاورات، معروف شعری تراکیب اور تلمیحات و امثال کا برمحل استعمال کرتے ہیں، جس سے اُن کی تحریر معنویت کے آہنگ کے ساتھ ساتھ شگفتگی کے رس سے بھی معمور ہو جاتی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ڈاکٹر تحسین فراقی ایسے عراقی نقاد ہیں جو اپنے اسلوب میں جمالیاتی پیرائے کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، جستجو، اظہار سنز پرنٹرز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۱۰

۲۔ ڈاکٹر تحسین فراقی سے مصاحبہ، مجلہ "ضیائے حدیث" شمارہ ۴، اپریل ۲۰۱۳ء، ص ۴۴

۳۔ ڈاکٹر تحسین فراقی سے مصاحبہ، ادبی ستارے، از عارف صبیح خان، مکتبۂ اُردو ادب، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۱۶۷

۴۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، جستجو، ص ۱۳-۱۴

۵۔ ایضاً، ص ۷

۶۔ ڈاکٹر تحسین فراقی سے مصاحبہ، ادبی ستارے، از عارف صبیح خان، ص ۱۶۸

۷۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، جستجو، ۱۴۴

۸۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، جہات اقبال، بزم اقبال، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۷

۹۔ ایضاً، ص ۱۷۴

۱۰۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، مطالعۂ بیدل، فکر برگساں کی روشنی میں از علامہ محمد اقبال، اقبال اکادمی، لاہور، ۲۰۱۸ء، (چوتھی اشاعت)، ص ۵

۱۱۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، اقبال ... چند نئے مباحث، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۳ء، (دوسری اشاعت)، ص ۹۵

۱۲۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، اقبال ... دیدۂ بینائے قوم، یورپ اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۴۱

۱۳۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، جستجو، ص ۷۱

۱۴۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، جہات اقبال، ص ۱۳۳-۱۳۵

۱۵۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، جستجو، ص ۱۱۴

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۱۶

۱۷۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، جہات اقبال، ص ۷۵

۱۸۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، اقبال ... چند نئے مباحث، ص ۱۰۹

۱۹۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، اقبال ... دیدۂ بینائے قوم، ص ۳۹

۲۰۔ ایضاً، ص ۴۰

۲۱۔ ایضاً، ص۱۶۰

۲۲۔ ایضاً، ص۹۷

۲۳۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، جہات اقبال، ص۴۰، ۴۱

۲۴۔ ایضاً، ص۴۲

۲۵۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، اقبال ۔۔۔ چند نئے مباحث، ص۵۹

۲۶۔ ایضاً، ص۹۲

۲۷۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، جستجو، ص۱۴۸

۲۸۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، اقبال ۔۔۔ دیدۂ بینائے قوم، ص۹۳

۲۹۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، مطالعہ بیدل، فکر برگساں کی روشنی میں از علامہ محمد اقبال، ص۱۱

۳۰۔ ایضاً، ص۱۷

۳۱۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، اقبال ۔۔۔ دیدۂ بینائے قوم، ص۱۳۳

۳۲۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، جہات اقبال، ص۸۹-۹۲

۳۳۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، اقبال ۔۔۔ چند نئے مباحث، ص۱۱۹-۱۲۰

۳۴۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، جہات اقبال، ص۱۸۰

۳۵۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، اقبال ۔۔۔ دیدۂ بینائے قوم، ص۱۸۶-۱۸۷

۳۶۔ ایضاً، ص۱۸۷-۱۸۸

۳۷۔ ایضاً، ص۱۸۱

۳۸۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، اقبال ۔۔۔ چند نئے مباحث، ص۳۰

۳۹۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، ''نقد اقبال ۔۔۔ حیات اقبال میں''، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص۵-۶

۴۰۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، ''غالب ۔۔۔ فکر و فرہنگ''، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء، ص۱۶۷

۴۱۔ ایضاً، ص۴

۴۲۔ ایضاً، ص۵

۴۳۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، جستجو، ص۶۵-۶۶

۴۴۔ ایضاً، ص۶۹-۷۰

۴۵۔ ڈاکٹر تحسین فراقی: ''غالب — فکر و فرہنگ''، ص ۱۷۰

۴۶۔ ایضاً، ص ۱۷۲

۴۷۔ ایضاً، ص ۱۵

۴۸۔ ایضاً، ص ۱۵

۴۹۔ ایضاً، ص ۶۹—۷۰

۵۰۔ ایضاً، ص ۹۰

۵۱۔ ایضاً، ص ۱۰۰

۵۲۔ ایضاً، ص ۱۰۳

۵۳۔ ایضاً، ص ۱۲۷

۵۴۔ ایضاً، ص ۱۶۱

۵۵۔ ڈاکٹر تحسین فراقی: ''دیوانِ غالب نسخۂ عرشی — اصل حقائق''، سورج پبلشنگ بیورو، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۹۰

۵۶۔ ڈاکٹر تحسین فراقی ''چلا آرہا ہوں سمندروں کے وصال سے''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۷

۵۷۔ ڈاکٹر تحسین فراقی ''حسن کوزہ گر'' شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۹، ص ۳۲

۵۸۔ ایضاً، ص ۳۶

۵۹۔ ایضاً، ص ۳۸

۶۰۔ ایضاً، ص ۳۸

۶۱۔ ایضاً، ص ۱۳۸-۱۳۹

۶۲۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، اداریہ بازیافت (ن م راشد نمبر) شعبۂ اردو، جامعہ پنجاب، لاہور، شمارہ ۱۶، جنوری تا جون، ۲۰۱۰ء، ص ۷-۸

۶۳۔ ڈاکٹر تحسین فراقی سے مصاحبہ، قومی ڈائجسٹ، فروری ۲۰۰۹ء، ص ۶۱

۶۴۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، ''عبدالماجد دریابادی — احوال و آثار''، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، ۲۰۰۶ء، (دوسری اشاعت)، ص ۷

۶۵۔ ایضاً، ص ۱۷۴-۱۷۵

۶۶۔ ایضاً، ص ۲۶۹-۲۷۰

۶۷۔ ایضاً، ص۳۰۱

۶۸۔ ایضاً، ص۳۰۹

۶۹۔ ایضاً، ص۳۳۴

۷۰۔ ایضاً، ص۳۵۰

۷۱۔ ایضاً، ص۳۵۴

۷۲۔ ایضاً، ص۳۶۱

۷۳۔ ایضاً، ص۳۷۴

۷۴۔ ایضاً، ص۳۹۶

۷۵۔ ایضاً، ص۳۹۹

۷۶۔ ایضاً، ص۴۲۶

۷۷۔ ایضاً، ص۴۶۷

۷۸۔ ایضاً، ص۵۱۷

۷۹۔ ایضاً، ص۵۲۱-۵۲۲

۸۰۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، "سلطان محمد" (مجموعہ مقالات سیرت عبدالماجد دریاآبادی)، دارالتذکیر، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۱۵-۱۶

۸۱۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، جستجو، ص۴۴

۸۲۔ ایضاً، ص۴۴

۸۳۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، "معاصر اردو ادب۔ تنقیدی مطالعات" کلیہ علوم اسلامیہ و شرقیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص۱۶

۸۴۔ ایضاً، ص۱۷

۸۵۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، جستجو، ص۴۳-۴۴

۸۶۔ ایضاً، ص۳۵

۸۷۔ ایضاً، ص۴۴

۸۸۔ ایضاً، ص۸۳-۸۴

۸۹۔ ایضاً،ص ۴۹

۹۰۔ ایضاً،ص ۵۱

۹۱۔ ایضاً،ص ۱۹۲-۱۹۳

۹۲۔ ایضاً،ص ۱۹۹

۹۳۔ ایضاً،ص ۲۰۳

۹۴۔ ڈاکٹر تحسین فراقی: "معاصر اردو ادب۔ نثری مطالعات"،ص ۹۷

۹۵۔ ایضاً،ص ۲۹

۹۶۔ ایضاً،ص ۹۱

۹۷۔ ایضاً،ص ۱۲۱

۹۸۔ ڈاکٹر تحسین فراقی: "نکات"، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۲۱۵-۲۱۶

۹۹۔ ڈاکٹر تحسین فراقی: "افادات"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۲۸۰

۱۰۰۔ ڈاکٹر تحسین فراقی: "نکات"، ص ۲۶

۱۰۱۔ ایضاً،ص ۹۱-۹۳

۱۰۲۔ ایضاً،ص ۱۰۱

۱۰۳۔ ڈاکٹر تحسین فراقی: "افادات"، ص ۱۸

۱۰۴۔ ایضاً،ص ۳۹

۱۰۵۔ ایضاً،ص ۶۰

۱۰۶۔ ایضاً،ص ۱۱۵

۱۰۷۔ ایضاً،ص ۱۰۲

۱۰۸۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، مقدمہ سخن آباد، (کلیات عرفان صدیقی)، رنگ ادب، کراچی، ص ۴۹

۱۰۹۔ ڈاکٹر تحسین فراقی: جستجو، ص ۱۰۳

۱۱۰۔ ڈاکٹر تحسین فراقی: "افادات"، ص ۴۳۹

۱۱۱۔ ایضاً،ص ۲۵۱

۱۱۲۔ ایضاً،ص ۲۸۵

۱۱۳۔ ڈاکٹر تحسین فراقی: "نکات"، ص ۴۲۸

۱۱۴۔ ڈاکٹر تحسین فراقی: جستجو، ص ۲۱۸

۱۱۵۔ ایضاً، ص ۴۳۱

۱۱۶۔ ڈاکٹر تحسین فراقی: "نکات"، ص ۴۴۴

۱۱۷۔ ڈاکٹر تحسین فراقی: "معاصر اردو ادب۔ نثری مطالعات"، ص ۱۸۴

۱۱۸۔ ڈاکٹر تحسین فراقی: "نکات"، ص ۴۴۰

۱۱۹۔ ایضاً، ص ۴۵۵

۱۲۰۔ ایضاً، ص ۴۵۹

۱۲۱۔ ڈاکٹر تحسین فراقی: "معاصر اردو ادب۔ نثری مطالعات"، ص ۱۵۹

۱۲۲۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، مقدمہ "[illegible]"، سنگ میل، لاہور، ۱۹۸۳، ص ۹۲

۱۲۳۔ ڈاکٹر تحسین فراقی: "نکات"، ص ۲۱۱-۲۱۲

باب سوم

ڈاکٹر تحسین فراقی کی شاعری

یوں مہاجرت کی ہے، یوں مسافرت کی ہے
بستیوں سے نکلے تھے، وحشتوں کے اندر ہیں

شاعری اسی مہاجرت کا نام ہے، شعور کی بستیوں سے دور کسی دشتِ وحشت کی مسافرت اختیار کرنا اور عمر بھر اُس کی سیاحی میں بسر کرنا۔ شاعری وہ جنوں ہے جسے میر نے شعور قرار دیا ہے۔ معاشرہ اس جنوں کے شعور کا ادراک کرے نہ کرے مگر یہ خلاق قلوب خوابوں کی صیقل گری کے تخلیقی کام کا تسلسل قائم رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی انھی صناع اور خلاق افراد میں شمار ہوتے ہیں۔ اُن کی شخصیت کی متنوع اور متفرق جہات ہیں اور ہر جہت میں اُن کا تخلیقی رویہ اپنی جلوہ گری ضرور دکھاتا ہے۔

اُردو کے ادبی ماحول میں ڈاکٹر تحسین فراقی کا اوّلیں تخلیقی تعارف اُن کی شاعری سے ہوا۔ یہ الگ بات کہ تحقیق، تنقید اور ترجمے کے عمل کے وفور کے باعث اُن کی مذکورہ تخلیقی جہت بحرِ بیکراں میں ایک سمٹے ہوئے جزیرے کی حیثیت اختیار کر گئی۔ لیکن اس امر سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اس جزیرے کی سیاحت جن جن کو بھی نصیب ہوئی وہ اس کی زرخیزی اور شادابی کے معترف ہیں۔

اپنی تخلیقی جہت یعنی شاعری اور نثری کاوشوں کے مابین توازن تلاش کرتے ہوئے ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنے بعض مصاحبوں میں چند اہم باتیں کی ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگرچہ انھوں نے نقد و تحقیق اور ترجمے کی وسعت کے باعث شاعری کو اس قدر وقت نہیں دیا لیکن غفلت بھی نہیں برتی۔ وہ کہتے ہیں:

> "بات یہ ہے کہ میں نے اپنے کیریر کا آغاز شاعری یعنی تخلیقی ادب سے کیا۔ پھر رفتہ رفتہ تنقید اور تحقیق کی طرف میلان بڑھتا گیا۔ شاید اس کا ایک سبب میرا

تدریسی پیشہ بھی رہا ہو، خصوصاً یونیورسٹی اور جنگل کالج سے میری وابستگی کو بھی
میرے تحقیقی وتنقیدی رجحان میں افزائش کا محرک کہا جا سکتا ہے۔ مجھے اپنی
شاعری اور نثر نگاری کو اس طرح باہم تقابل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اتنی بات
بہرحال طے ہے کہ شاعری ہمیشہ نثری کاوشوں خصوصاً تنقیدی وتحقیقی تحریروں
کے مقابلے میں زیادہ گہری اور موثر رہی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شاعری کا
براہِ راست رشتہ انسانی جذبات ومحسوسات کے بے روک اور بے ساختہ اظہار
سے ہوتا ہے۔ سادہ لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ اس میں دل کی باتیں ہوتی ہیں۔
اس کے مقابل نثر میں زیادہ تر تجزیے، منطق اور استدلال کی کارفرمائی ہوتی ہے
منطق اور دلیل جتنا بھی وزن رکھتی ہو، جذبہ واحساس کے مقابلے میں کم تاثیر
ہوتی ہے۔ شاید یہی معاملہ میری شاعری اور میری نثر کے ساتھ ہے۔ حالی نے
کہا تھا: جو غزل کہتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی۔ میری غزلوں اور نظموں کا معاملہ
بھی ایسا ہی ہے لہٰذا ان کی تاثیر کا نثر کے مقابلے میں بمراتب آگے اور بڑھا ہوا
ہونا باعثِ تعجب نہیں ہونا چاہیے۔" (۱)

ڈاکٹر تحسین فراقی کی شاعری تاثیر بھی رکھتی ہے اور حالی کی مثال کی روشنی میں اُن کی تخلیقی کاوشوں میں اُن کا اپنا آپ بھی سراسر بلکہ سرتاپا نظر آتا ہے لیکن شعر کے ساتھ زیادہ وقت نہ گزار سکنے پر اُن کے ورقِ دل پر حرفِ افسوس بھی رقم ہے۔ وہ معترف ہیں کہ:

"میں اپنی ملکۂ شاعری کے حضور شرمندہ ہوں۔ میں نے اس کے وہ ناز نہیں
اُٹھائے جیسا اُٹھانے کا حق تھا۔ دراصل تحقیقی وتنقیدی کام کی طرف میرے
میلان نے میرے اندر کے شاعر کو جکڑ رکھا ہے۔ جب کبھی اسے بقدرِ وسعت
زنجیر آزادی ملتی ہے تو دو چار شعر ایک آدھ غزل نظم کہہ لیتا ہوں۔" (۲)

ڈاکٹر تحسین فراقی کے اب تک دو شعری مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں:

ا۔ نقشِ اوّل

۲۔ شاخِ زریاب

اُن کے شعری سفر کی ابتدائی دستاویز میں اُن کے تخلیقی میلانات کا جو "نقشِ اوّل" سامنے آیا، اُس

میں زبان کے پختہ شعور اور فکر کی صلابت کا عنصر نمایاں تھا۔ اُن کے مخصوص مزاج سے مطابقت رکھتے شعری سرمائے نے سنجیدہ اسلوب کے ساتھ جن غزلوں اور نظموں کا روپ اختیار کیا، وہ عددی لحاظ سے تو بہت زیادہ نہیں ہے لیکن اپنے معیار و مرتبہ کے اعتبار سے یقیناً وسعت و اہمیت کا حامل ہے۔

"نقشِ اول" میں شامل اشعار میں جہاں دیگر اوصاف نمایاں تھے، وہاں بعض ایسے اشعار بھی تھے، جن میں تخلیقی تجربہ واضح تھا۔ اردو غزل نے کچھ دہائیوں میں جو مخصوص اسلوب اختیار کیا ہے اُس میں شعرا کے ذہنی میلان میں یہ پہلو بطورِ خاص لائقِ توجہ ہے کہ وہ اپنے تخلیقی شعری تجربے کی پیشکش کو ترجیح دیتے ہیں اور محض خیال کی موزونیت یا الفاظ کے انتخاب کو شاعری نہیں خیال کرتے۔

شعری تجربہ دراصل زندگی یا اس سے متعلق معمول کے تجربات کو قطعی نئے زاویے سے دیکھنے کا نام ہے، دوسرے الفاظ میں اردگرد کے ماحول کو اُس بیگانگی سے دیکھنا ہے جسے جدید تنقید نے Defamiliarization کا نام دیا ہے۔ یہ اُن امکانی صداقتوں کو دیکھنا ہے جو سائنسی یا ریاضیاتی پیمانوں کی روشنی میں قطعی غلط ہو سکتی ہیں لیکن شعری تجربہ اُن کے لیے بہر طور جواز پیش کر رہا ہوتا ہے۔ گویا وہ پہلو جن کا ادراک بصارت نہیں کر سکتی لیکن شعری بصیرت کے لیے وہ ممکن ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنے شعری تجربے کو کئی ایک اسالیب میں بیان کیا ہے لیکن جب وہ اپنے محسوسات کو کوئی تمثالی پیکر عطا کرتے ہیں تو ایک عجیب ذائقے کا احساس ہوتا ہے۔ مثلاً یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

میں اپنے گریۂ گم نام پہ پشیماں ہوں
میں کھل کے برسا تو ہوں، ابر بن کے چھایا نہیں

کبھی خواب میں، کبھی رتجگوں کے عذاب میں
وہ ستارۂ سرِ کہکشاں نہیں بجھتا

گندھے ہوئے ہیں مرے آنسوؤں میں عکس ترے
ان آئنوں میں خدوخال آ کے گن اپنے

میں اب بھی تجھے پکارتا ہوں
اے کوہِ ندا کے خواب چہرہ

وہ میرے پاس نہیں، میرے دل کے پاس تو ہے
چراغ ایک ہے اور دو گھروں میں جلتا ہے

ان اشعار میں ابر، ستارہ، آئینہ، کوہِ ندا اور چراغ کے استعاروں کے ذریعے جو شعری تصویر کاری کی گئی ہے اُس میں مفہوم کی پرتیں کسی روایتی "معنی" کی طرف اشارہ نہیں کرتیں بلکہ قطعی طور پر ایک الگ شعری تجربہ محسوس ہوتا ہے۔ دلچسپ امر یہ بھی ہے کہ یہ استعارے اُس مخصوص رعایتِ لفظی یا تلازمات کا پتا بھی نہیں دیتے جن کی پاسداری ہماری شعری روایت میں عموماً کی جاتی رہی ہے۔

معروضی حقائق کی روشنی میں دیکھیں تو ڈاکٹر تحسین فراقی کا شعری سفر ایک المناک واقعے سے آغاز پذیر ہوتا ہے اور اس کے اثرات اُن کے فکری نظام اور اسلوبی پیرایوں پر بڑے واضح ہیں۔ پاکستانی اردو شاعری میں سانحہ سقوطِ مشرقی پاکستان کی کئی ایک تصویریں پیش کی گئی ہیں اور اس سانحے کو شعرا نے نہایت غم انگیز لے میں پیش کیا ہے۔ ناصر کاظمی سے لے کر جلیل عالی اور غلام محمد قاصر تک کئی ایک شعرا نے اس سانحے کے بارے میں یہ غم انگیز لے نظم کی ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس واقعے کے غم کو جن شعری پیکروں میں ڈھالا ہے اُس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

جب پھول یوں بکھر گئے اور باغ اجڑ گئے
پیکِ خزاں کے دل میں پھپھولے نہ پڑ گئے؟
ذوقِ سفر کے ساتھ سلیقہ بھی شرط ہے
وہ گام ہی چلے تھے کہ پاؤں اکھڑ گئے

"نقشِ اوّل" کی شاعری میں حقیقتِ انسان اور فطرتِ بشر کے بعض پہلوؤں کو بڑی دردمندی سے نظم کیا گیا ہے۔ انسان کیا ہے؟ اور اس کی فطرت نے کرۂ ارض پر خیر و شر ہر دو حوالوں سے کیا کیا کام سرانجام دیے ہیں، ڈاکٹر تحسین فراقی اُن کو گہرے تنقیدی شعور کے ساتھ دیکھتے ہیں اور اپنے فکری نتائج کو اثر انگیز اسلوب میں بیان کرتے ہیں۔ انسان کے بارے میں اُن کے اشعار میں بہجت، حظ اور ملال ہر طرح کا رویہ ابھرتا ہے جس کی بنیاد ظاہر ہے کہ انسانی فطرت کا وہ مظاہرہ ہے جو ارتقا، زوال یا ظلم کو ظاہر

کرتا ہے۔ وہ انسانی بصیرت کے مداح بھی ہیں اور بشر کے اندر موجود پہلوئے شر پر ماتم کناں بھی۔ وہ انسان کے مثبت اور منفی ہر دو رخوں کی تمثالیں بناتے ہیں لیکن اپنی شاعرانہ مثالیت پسندی کے باعث اُس انسان کی جستجو بھی کرتے ہیں جو اپنی صفات ہی میں یکتا نہیں بلکہ نوعِ بشر کے لیے ظلمات سے نجات دہندہ بھی ثابت ہوتا ہے۔

انسان کے شر انگیز پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے ڈاکٹر تحسین فراقی نے طبقاتی کشمکش میں پسے ہوئے افراد کا دکھ ایک خاص تہذیبی لب و لہجے کے ساتھ بیان کیا ہے۔ عموماً اس نوع کے مسائل کو بیان کرتے ہوئے بعض شعرا کا توازنِ اسلوب برقرار نہیں رہتا اور وہ شعر اور بیانِ محض (Statement) میں تمیز کو فراموش کر دیتے ہیں لیکن جب ہم اس طرح کے اشعار دیکھتے ہیں تو تخلیق کار کا شعورِ فن اپنی داد آپ چاہتا ہے:-

میں سانس سانس کا مع سود دے چکا ہوں حساب
محاسبو! مرے ذمے کوئی بقایا نہیں

ذ ہے اجارہ یہاں کے بلند باموں کا
کہ صحن تو ایک طرف دھوپ ادھر نہیں آئی

داخلی سطح پر ڈاکٹر تحسین فراقی کی شاعری میں ایک گمشدہ کردار کئی ایک فن پاروں میں اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ ایک ہجرِ مسلسل ہے جس میں لذتِ طلب اُس کردار کی مختلف انداز میں تصویر کشی کرتی ہے۔ "نقشِ اول" میں بعض غزلیں تمام کی تمام اس کیفیت کی سرشاری میں ڈوبی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اس کیفیت کے زیرِ اثر بہت سے عمدہ اشعار کی تخلیق تو ہوئی ہی ہے لیکن بعض ایسی تراکیب بھی ہیں جو اپنی جانب توجہ کھینچتی ہیں۔ ان تراکیب میں اُس کردار کے اوصاف جس طور سے بیان کیے گئے ہیں، اُن میں اُس کی ہستی کی نفاست ہی نہیں تخلیق کار کے اظہار کی نزاکت بھی واضح ہے۔ مثلاً ضمیرِ جان و دل کا زمزمہ تازہ کار، اشکوں کی آبجو کے کنارے تھے، جس کے ہاتھ اور آہوں کے جنگلوں کا رمیدہ ہرن ایسی تشبیہات ہیں جن کے اندر ندرت کا پہلو اپنے کمال پر ہے۔ اسی طرح "چہرہ" کی ردیف میں جو غزل تخلیق ہوئی ہے وہ بھی بڑی نادر تشبیہات اور امثال کے ساتھ اس کردار کی نقشہ کشی کرتی ہے اور ان خوبصورت نقوش اور تخلیقی رنگ کے حامل اشعار کے باوجود بھی اگر ایک شاعر کو یہ احساس ہو کہ "گرفتِ جاں میں ترے

خدوخال آنہیں سکتے" تو اسے یا تو عجز کہا جائے گا یا کیٹس کے لفظوں میں یہ وہ negative capability کا احساس ہے جو کسی فن کار کے فن میں ہر لحظہ ارتقا کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے۔ یہ دو شعر ملاحظہ ہوں اور دیکھیے کہ ایک کیفیت کو کس پر تاثیر اسلوب کے قالب میں ڈھالا گیا ہے:

نہاں نظر سے ہے اور وہ بدو پکارتا ہے
یہ کون ہے جو مجھے چار سو پکارتا ہے
نہ اُس سے رشتۂ جاں ہے نہ اُس سے ربطِ نظر
تو کس لیے اُسے میرا لہو پکارتا ہے

ڈاکٹر تحسین فراقی کا دوسرا مجموعۂ کلام "شاخِ زریاب" کا عنوان نظر سے گزرا تو ذہن فوری طور پر شکر فریزر کی کتاب "Golden Bough" کی طرف گیا جس میں فاضل مصنف نے اساطیر اور اُن سے وابستہ انسانی تصورات کا مطالعہ بڑی باریک بینی سے کیا ہے۔ یہ کتاب شعورِ انسانی کی تاریخ کے ماضی قدیم کے باب سے متعلق ہے۔ اس کے صفحات میں بعض حقائق کی تصویر کشی اس طور کی گئی ہے کہ زمانِ گذشتہ اپنی دلچسپیوں اور بوالعجبیوں کے باعث قاری کو اپنی گرفت میں لیتا چلا جاتا ہے۔

شکر فریزر کی "Golden Bough" اور ڈاکٹر تحسین فراقی کی "شاخِ زریاب" میں عنوان کے سوا کوئی موضوعاتی مماثلت نہیں ہے لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس مجموعۂ شعری کی ابتدائی سات غزلیں شاعر کے ماضی کے بعض حقائق سے ایک عجیب انداز سے پردہ اٹھاتی ہیں۔ ان غزلوں میں ایک خاص طرح کا یادنگر آباد ہے جس کے کانچ دوسے گزرتے ہوئے تخلیق کار نے طرفہ دریچے نکالے ہیں جن کی آب و تاب نے نہ صرف اپنے فریاد کو ایک سحر میں مبتلا کیا ہے بلکہ قاری کو بھی خیرہ نگاہی کے اسباب بہم پہنچائے ہیں۔

مذکورہ ابتدائی غزلیں اپنے مزاج کے لحاظ سے نقشِ اول کی اُن غزلوں کا تسلسل ہی ہیں جن میں ماضی کا کوئی کردار اپنی جھلک بار بار دکھاتا ہے لیکن ان غزلوں کے اشعار میں جس نوع کی تمثالیں ہیں اُن میں اسلوب کی پختہ کاری کے ساتھ ساتھ شعری تجربے کا ستارہ اوجِ کمال پر دمکتا دکھائی دیتا ہے۔

اس سلسلۂ غزل کے پہلے چار میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے جو اشعار پروئے ہیں وہ اپنے اندر ایک اساطیری کہانی کے احوال اپنا تسلسل رکھتے ہیں۔ ماضی کے ایک خاص کردار کے پیکر کے اوصاف جمال، اُس کے دھیان کی لا اور حصار کی سحرکاری اور اس پس منظر میں لحظۂ حال کی اداسی کی تصویریں اپنے اندر ایک عجیب کیفیت کو ابھارتے ہیں:

عجیب دن تھے کہ تھی پور پور وقفِ جمال
ستارے ڈھالتے قوسِ قزح بناتے ہوئے
تہِ فلک سے لگا ہاتھ جب خزانۂ حسن
مثالِ زہرۂ شب تاب جگمگاتے ہوئے
اُسے سمیٹ لیا دل نے ایک آن کے بیچ
نگاہ، خیرہ تھی گو اُس کی تاب لاتے ہوئے

یہ غزل اپنے اندر اس ملال کو سمیٹے ہوئے ہے کہ سرود و علم کے سرور میں کوئی شبہ نہیں لیکن زندگی میں محض طلب تو بھی ایک ادھورے پن کو جنم دیتی ہے اور زندگی کی تکمیل کے لیے اس طلب کے ساتھ ساتھ وہ ذوقِ حلاوت بھی ماند نہیں پڑنا چاہیے جو حسن کے احساس اور قربِ جمال کے باعث زندگی میں ایک سرشاری کو تاباں رکھتا ہے۔

اس مجموعے کے ابتدائی کُل غزل کی دیگر شاخ ہائے زریاب کو دیکھیں تو زندگی میں احساسِ جمال کے باعث پیدا ہونے والی مٹھاس سے دوری اور فراق کا دکھ کئی ایک معدوم اور "عشق خیز" تشکیلوں میں ظاہر ہوا ہے۔

ان غزلوں میں سوز و ساز زندگی کا آہنگ متنوع موضوعات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے لیکن مجموعی سطح پر یہ اشعار دراصل "تحسینِ فراق" میں ہیں اور ان میں شاعر خود ایک اسمِ با مسمّٰی کردار کی صورت میں ظہور پذیر ہوا ہے۔

پھر اُس کی یاد نے دستک دلِ حزیں پہ دی
پھر آنسوؤں میں نہاں اُس کے خد و خال ہوئے

مری مدد کو مرے آنسوؤ! چلے آؤ
نواحِ جاں میں جگر مشتعل اگر ہو جائے

ترے فراق میں دل جل کے سیم خام ہوا
فنا کی بھٹی چڑھا، حاصلِ دوام ہوا

کوہ و صحرا میں بھٹکتے، سرِ ساحل پھرتے
میں نے ہر گام صدا کی تو تمھارے لیے کی

"شاخِ زریاب" کی غزلیں جہاں احساسِ فراق کی داخلی کیفیتوں کا کیف رکھتی ہیں، وہاں بعض خارجی مسائل کی تخلیقی عکس بندی بھی کرتی ہیں۔ خصوصاً نوّے کی دہائی میں حصولِ اقتدار کی رسہ کشی نے جس طرح کے سماجی انتشار کو جنم دیا اور ملک میں جس بدعنوانی کی ثقافت نے ملک کو عدمِ استحکام سے دوچار کیا اُس کا اظہار ان غزلوں میں متنوع زاویوں میں کیا گیا ہے۔ اس دہائی میں سیاسی [illegible] محاذ کے پیچھے اُس فکری کشمکش کا عنصر بھی تھا جو دائیں بازو اور بائیں بازو کی فکر کے حوالے سے کارفرما رہا ہے اور اہلِ سیاست ان افکار سے خود کو مصنوعی انداز سے وابستہ کر کے اپنے سیاسی قد کاٹھ میں اضافہ کرتے تھے اور اسی بناوٹی قامت کی بنیاد پر عوام تو کیا بعض اہلِ دانش سے بھی اپنی فکری ہمدردیاں سمیٹتے رہے ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کا شمار ان اہلِ نظر و نقد میں ہوتا ہے جن کی تخلیقی و تنقیدی کاوشوں کا ایک فکری پس منظر ہے اور وہ اپنی تحریروں میں ایک خاص زاویۂ نظر بھی رکھتے ہیں۔ یہی تخلیقی صورتِ حال اُن کی غزلوں میں بھی ہے اور وہ مذکورہ دہائی کے سیاسی منظر نامے کی نہ صرف تصویر کشی کرتے ہیں بلکہ اس پر اپنا فکری زاویہ بھی پیش کرتے ہیں:

یہ کیا ہوا کہ صفِ دشمناں سے جا ملا ہے
شریفِ شہر تھا اور سفلگاں سے جا ملا ہے

علاج کیا ہو شغالوں کا ، بد سگالوں کا
یہ شیرِ نر کا کوئی ہمہمہ ہی طے کرے گا

آدھا باغ لٹا دیتا تھا، جن کے بائیں ہاتھ کا کھیل
باقی باغ بسانا ایسے فرزانوں کے بس میں نہیں

ان اشعار میں "شریفِ شہر" اور "شیرِ نر" کی تراکیب ایک خاص سیاسی پس منظر کا پتا دیتی ہیں اور "بائیں ہاتھ کا کھیل ہونا" کے محاورے کو انھوں نے جس سیاسی علامت کے رنگ میں پیش کیا اُس کی تحسین وہی کر سکتے ہیں جو زبان کی نزاکتیں اور ایما کا حسن جانتے ہیں۔

اُردو غزل کی فکری روایت میں ایک موضوع مرثیہ بھی رہا ہے۔ اسداللہ خاں غالب سے بیدل حیدری تک بہت سے شعرا نے کسی حادثۂ مرگ پر بڑے جاں کاہ اسلوب میں اشعار کہے ہیں۔ صابر ظفر کا مجموعۂ کلام "بے آہٹ چلی آتی ہے موت" کی تمام تر غزلیں اپنے جواں سال بیٹے کے مراثی ہیں۔ "شاخِ زریاب" میں سات غزلوں پر مشتمل ایک باب اس روایت کا تسلسل ہے جس میں غم والم کی لے ہی نہیں بلکہ بے ثباتیِ حیات اور فنا و بقا کے تصورات کا اظہار بھی ایک خاص قرینۂ شعری کے ساتھ ہوا ہے۔ ان غزلوں میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے کیفیاتِ غم کا بیان اُس تمثالی پیرائے میں کیا ہے جو اُن کا خاص اسلوب ہے۔ اس کے علاوہ بعض تراکیب بھی اہلِ فن کی توجہ خاص چاہتی ہیں۔ مثلاً آہوئے دشتِ جاں، کوہ ندائے قلب، آتشِ سیلِ فنا ایسی تراکیب ہیں جن میں کسی صفت کی ایک منفرد شعری پیرائے میں تجسیم کی گئی ہے۔

اے سروِ باغِ جاں! ترے جانے کے دن نہ تھے
اے نازِ [illegible]اں! ترے جانے کے دن نہ تھے

پل بھر میں اک طرارا بھرا اور ہوا ہوا
آہوئے دشتِ جاں! ترے جانے کے دن نہ تھے

سینے میں آگ شعلہ فشاں، لب فغاں فغاں
دل ہے دھواں دھواں ترے جانے کے دن نہ تھے

کوہ ندائے قلب سے ہر شب کو پچھلے پہر
اُٹھتی ہے اک فغاں ترے جانے کے دن نہ تھے

کیسا غروب، وقتِ طلوعِ سحر ہوا
خورشیدِ خاوراں! ترے جانے کے دن نہ تھے

ہجر کا غم مجھے ہر لحظہ ستاتا رہے گا
جو مرے دھیان میں آتا ہے وہ آتا رہے گا

سانس کا تار ہے سینے میں سلامت جب تک
طائرِ جاں کبھی روتا کبھی گاتا رہے گا

وقت مرہم ہے، یہ سنتا ہوں تو کانپ اُٹھتا ہوں
کیا مرے دل سے کبھی غم ترا جاتا رہے گا

توڑتا جائے گا دن بھر مجھے میرا دشمن
رات بھر چاک مرا، مجھ کو بناتا رہے گا

بھاگ لو وقت سے ورنہ یہ دغا باز تمھیں
انگلیوں پر یونہی دن رات نچاتا رہے گا

ڈاکٹر تحسین فراقی کی تازہ غزلوں میں بھی سیاسی و سماجی صورتِ حال کی وہ عکاسی نمایاں ہیں جو اُن کے مدوّن کلام میں جابجا نظر آتی ہے۔ ان اشعار میں نائن الیون کے بعد کے عالمی حالات اور اُس کے تناظر میں ملکِ پاکستان کے دروں خانہ معاملات پر اُن کی توجہ ایک اور گمبھیرتا کے ساتھ سامنے آئی ہے۔ ان کے ہاں رنج و غم سے زیادہ ولب آزادگی اور غصے کا پہلو بھی ظاہر ہوتا ہے اور اُس طرزِ احساس کی جھلک واضح محسوس ہوتی ہے جو معاصر حالات میں دائیں بازو کے اہلِ فکر کے ہاں ابھر کر سامنے آیا:

سرفروشوں نے بھی کب سر دیے اس معرکے میں
ہم نے بھی ہاتھ کھڑے کر دیے اس معرکے میں
خوں بہا کس کے عوض مانگتے پھرتے ہو یہاں
تم نے تو ریت میں سر کر دیے اس معرکے میں
اکثریت نے معا پھینک دیے تھے ہتھیار
چند ہی سر پھرے سر کر دیے اس معرکے میں

کون تھا میرِ کارواں ، کون تھا کن کے درمیاں
کس کو چڑھی ہوئی تھی تب ، اب مجھے یاد بھی نہیں

کیا کہیں ٹین راہ میں تشنۂ آب تھا ، جہاں
گشت پہ فوج "یزاب" اب مجھے یاد بھی نہیں

بعض داخلی کیفیات کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اُن کے ہاں ن۔م راشد کی مثل گردشِ وقت سے یہ سوال تکرار کے ساتھ سنائی دیتا ہے کہ "کہاں سے ، کس سمت سے کاسۂ ہوس میں سے آئے؟"

عمر گزری ہے میاں سے دستی تیری
کچھ تو کر ڈال میاں کارِ ثواب آخر کار

اب نہ آؤ گے تو شاید تمھیں پچھتانا پڑے
یہ مرا آخری پیغام بھی ہو سکتا ہے

ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنی کچھ غزلیں ظفر اقبال کی نذر بھی کی ہیں اور بعض غزلوں میں اُن کا اسلوبِ کلام رنگِ ظفر سے مماثل بھی نظر آتا ہے:

لب تشنۂ تہہ گئے ہیں ہم بھی
پا کر تری شہہ گئے ہیں ہم بھی
ہوتی ہے تباہی جو بھی ہو جائے
باتوں سے لہہ گئے ہیں ہم بھی

کہیں سے بھی مجبور و مظلوم نہیں
کوئی درد ماتھے پہ مرقوم نہیں
وہ بہروپیا ہے ارے خوش نظر
تو ہاتھ اُس کے یوں دم بہ دم چوم مت

ڈاکٹر تحسین فراقی کی اردو غزل میں فارسی کا رچاؤ تو شروع ہی سے موجود رہا ہے اور اُن کی شاعری

میں حسنِ ترکیب سازی اسی رچاؤ کے باعث ہی ہے لیکن یہ امر خوش آئند ہے کہ اُن کے شعری سرمائے میں فارسی غزل کا اثاثہ بھی شامل ہے اور "شاخِ زریاب" پر ان مجھی برگ و بار نے الگ طلائی آب و تاب پیدا کی ہے۔ یہ غزلیں اگرچہ عددی لحاظ سے بہت قلیل ہیں لیکن اپنی معنوی گہرائی اور اظہار کی ندرت کے باعث ایک منفرد آہنگ جمال رکھتی ہیں۔ ان اشعار میں شعرِ فارسی کے کلاسیکس رومی، حافظ، عرفی اور بیدل کا تتبع ایک جدید پیرائے میں دکھائی دیتا ہے۔

یہ غزلیں تصوف کی روحانی روایت سے بھی تعلق رکھتی ہیں، فارسی شاعری کی بنیادی شناخت تغزل کا سوز و ساز بھی ایک خاص غنائی آہنگ کے ساتھ دکھائی دیتا ہے اور ان میں عصری آگہی کا رنگ بھی واضح ہے جس کا اظہار بالواسطہ اور علامتی ہر دو اسلوب میں ہے:

ما بہ صحرائے جنوں برہنہ پا می رقصیم
ما چہ دانیم کہ ما را خلشِ خار کجاست
سیلِ بے مہر ز ایوانِ شکستہ پُرسد
آن ہمہ سقف و ستون و در و دیوار کجاست

تندر و باران نور و ہوش و مستانہ رقص
از زمین تا آسمان یک عالمِ اسرار بود

ڈاکٹر تحسین فراقی کی غزل کے مذکورہ نمونے دیکھیں اور ان کے فکری و اسلوبی اوصاف کو کسی جامع اظہار کا روپ دیا جائے تو شاید مؤخر الذکر فارسی شعر اُس کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔ زندگی کے گوناگوں خارجی مسائل، عالمی سیاسی منظر نامہ اور اُس کے انسانی زندگی پر اثرات سے لے کر فرد کی داخلی کیفیات اور نازک سے نازک تر احساسات کو جس نفیس قرینۂ شعری کے ساتھ ان غزلوں میں جامۂ اظہار عطا کیا گیا ہے وہ لائق تحسین بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔

اُن کی شاعری کو اُن کی علمی شخصیت کے تناظر میں رکھ کر اس امر پر حیرت کا اظہار نامناسب ہے کہ وہ ایک ناقد ہیں اور ناقدین کی شاعری بمشکل ہی اچھی ہوتی ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ایک تو تخلیق کی دیوی اپنے التفات کے لیے کسی فرد کے شعبے، پیشے یا دائرۂ کار کو نہیں دیکھتی، دوسرا یہ کہ زندگی کو ایک کل کی صورت میں دیکھنا چاہیے اور جب ہم زندگی کو اس کی کلیت میں دیکھیں گے تو فن کو پرکھنے کا یقینی

ایک نیا تخلیقی زاویہ سامنے آئے گا اور اسی زاویۂ نظر کو اختیار کرتے ہوئے میں ڈاکٹر تحسین فراقی کی غزل کے مطالعے کی دعوت دیتا ہوں اور مجھے پورا یقین ہے کہ جب آپ اُن کے اشعار کو پڑھیں گے تو محسوس کریں گے کہ:

بجہ یک مرحبا از طرفِ گلشنِ جاں
سر بہ سر مُشک فشاں شد تا ہا یا ہو

ڈاکٹر تحسین فراقی کی نظم اُن فکری و نظری معاملات سے زیادہ گہرا ربط و ضبط رکھتی ہے۔ جو اُن کی غزل میں نظر آتے ہیں اور اپنے پیرایۂ اظہار میں قدرے شدت سے دکھائی دیتے ہیں۔ خصوصاً جب وہ معاصر عالمی حالات پر نظر ڈالتے ہیں یا اپنے ملک میں سیاسی جوار بھاٹا پر نگہ کرتے ہیں تو ایک دائرۂ افسوس انھیں اپنے حصار میں لے لیتا ہے اور وہ اپنے رنج و ملال کو شدید احساسِ کرب کے ساتھ نظم کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں اُن کی بعض تخلیقات بہ طورِ خاص توجہ چاہتی ہیں لیکن عصری حالات پر انھوں نے جس طرح ''نعتیہ شہر آشوب'' میں دردانگیز اظہار کیا ہے اُس کا اسلوب اپنی مثال آپ ہے:

اے ذاتِ احد کے ناز بردار
امت تری خادمِ بتاں ہے
کل تک جو میرِ کارواں تھی
اب دیکھو تو گردِ کارواں ہے
فریاد ہے اے رسولِ رحمت
ہر دو ترا کب سے نوحہ خواں ہے
اے سیّدِ مرسلانِ سابق
تو باعثِ حرفِ کن فکاں ہے
بستی بستی ہے نام تیرا
عالم عالم ترا بیاں ہے
یہ ریگِ رواں کا بحرِ مواج
سیراب سحاب بے کراں ہے

اے وہ کہ ترا ہی نامِ نامی
تسکینِ دل و قرارِ جاں ہے
تو بارشِ رحمتِ دو عالم
تو بادِ بہارِ بے دلاں ہے
اس ملتِ ہرزہ کار پہ بھی
رحمت، کہ یہ رہنِ امتحاں ہے

ڈاکٹر تحسین فراقی کی نظم کا فکری پس منظر دو ایسی دہائیوں سے تعلق رکھتا ہے جس میں ایک تہذیبی مناقشہ سماج کی کئی ایک سطحوں پر موجود تھا۔ پہاڑوں کے اُس پار لڑی جانے والی جنگ بہت سے اہلِ دانش کے لیے ایک آدرش کا درجہ رکھتی تھی۔

خصوصاً جب باہر سے آنے والی فوجوں کو واپس جانا پڑا اور سوویت یونین ایسی بڑی طاقت کے حصے بخرے ہو گئے تو ایک فتحِ عظیم کا احساس پیدا ہوا لیکن بعد ازاں حالات نے کچھ اور ہی رنگ دکھا دیے اور جن عالمی مفادات کے لیے یہ جنگ لڑی گئی اُن کے حصول کے لیے آگ اور خون کے ایک اور کھیل کی بساط بچھا دی گئی۔

دوسری طرف خود وطنِ عزیز میں سرد جنگ کے ان اثرات نے گہرے اثرات مرتب کیے۔ ایک طرف جمہوری تسلسل بار بار منقطع ہوا تو دوسری طرف اہلِ بصیرت ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو تشکیک سے دیکھ رہے تھے۔

عالمی سرد جنگ اور تہذیبی تصادم کی یہ وہ صورت حال ہے جس سے ڈاکٹر تحسین فراقی کی نظم کا خمیر اُٹھتا ہے اور وہ اپنی بصیرت اور نقطۂ نظر پر استقامت سے قائم رہتے ہوئے عالمی آقاؤں سے لے کر مقامی اہلِ سیاست کے بارے میں نہایت درد آمیز اسلوب میں اپنے احساس کو رقم کرتے ہیں:

عجب سرطاں زدہ قریہ ہے یہ قریہ
کہا جاتا ہے یاں میداں، پہاڑ اور دشت سب کچھ ہیں
مگر مجھ کو تو بس حدِ نظر تک ریت کے مرتے ہوئے ٹیلے نظر آتے ہیں
جن کے ذرے ذرے کی زباں تشنہ ہے
اک اک بوند پانی کو ترستی ہے

یہاں ایمان واقدار و عقائد کی محض ظلمت برستی ہے
عجب یزداں پرستی ہے
یہاں کے رہنے والے اپنے سینوں سے
ابھی تک عہدِ پارینہ کے اوراقِ دریدہ کو لگائے مست ہیں
یہ کیسی مستی ہے
عجب اندھوں کی بستی ہے!

ہماری منتظر آنکھیں تو پتھر ہو گئیں
اور سر ہمارے برف کے گالے
محراب تک سمند برق پا پر سوار خضر صورت
گرد میں گم ہے
ابھی اس نجم دور افتادہ کی کوئی کرن
ہم تک نہیں پہنچی
یہاں بس اپنی دستاروں کے جھگڑے ہیں
ہمارے جوہر ذاتی کو سرطاں کھا چکا خود پروری کا
خود پرستی کا

اور اس پر یہ امیدیں ہیں
کوئی طارق، کوئی قاسم، کوئی ایوبی، دوراں، کوئی سلطاں، کوئی فاتح
یقیناً اب بھی آئے گا
اسی امید پر ہم نے کئی صدیاں گنوا دیں۔۔۔۔!
یہ سوچا ہی نہیں ہم نے
یہ سمجھا ہی نہیں ہم کو
ید بیضا، عصائے موسوی کا دور کب کا ہو چکا۔۔۔۔!
وہ جس کے فیض سے ہاتھوں میں بے جاں اور بے آواز

پتھر بولتے تھے

اب نہ آئے گا

یہ سوچا ہی نہیں ہم نے
کہ برفوں اور بزغالوں کی دنیا کس قدر کمزور دنیا ہے
جہاں سب شیر کچا ماس کھانے کے بجائے گھاس کو ترجیح دیتے ہیں
وہیں ایسے خیالِ خام پکتے ہیں
ہمارے دانت کب کے گر چکے ہیں
اور ہمارے پوپلے مونہوں کو
اب تک کچھ خبر ہونے نہیں پائی!

کئی صدیوں سے اپنی کشتیوں کو راکھ کر دینے کی ریتیں۔۔۔
بیابانِ ہوس کی گرد میں گم ہو چکی ہیں۔۔۔!
ہمارے دستِ ناہنجار و ہرزہ کار و رعشہ دار سے
اب خنجر و شمشیر کب کے گر چکے ہیں۔۔۔
ہماری بے کلاہی، بے حسیت آرزوئیں
ان گنت کشکول تھامے
غرب سے "قرطاسِ ابیض" کی گدائی کر رہی ہیں
یا کسی پوشیدہ "ہرے اشارے" کی تمنائی!
خیالوں کے تجسّس یافتہ راہب
اپنی کشمکش کے برابر سر ہلاتے
اپنی میلی سرد مسکانوں کی کلیوں سے
ہمیں اب بھی لبھاتے ہیں
یہ ششماہے، یہ ستوانسے
ہماری کشتیوں کو، جن پہ سایہ ہے نہ کوئی بادباں ہے

بس بہکائے جا رہے ہیں اک سرابِ بے کرانی میں

ہمیں یہ بھولنا زیبا نہیں

ایسے سفینے

جلد یا کچھ دیر سے لیکن بہ ہر صورت، بالآخر ڈوب جاتے ہیں

سرابوں سے جو بچ نکلیں تو پھر یہ ساحلوں پر ڈوب جاتے ہیں (۳)

ان نظموں کے تلمیحاتی نظام پر غور کریں تو ڈاکٹر تحسین فراقی کے ہاں تاریخ کے عسکری کردار نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں۔ جو معاصر تہذیبی تصادم کو ماضی کے بعض واقعات سے جوڑ کر ایک تاریخی معنویت کو اجاگر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کی نظموں کا ایک اور بڑا موضوع ماحول دوستی ہے۔ جس کا اظہار وہ کئی ایک زاویوں سے کرتے ہیں۔ ماحول دوستی پر انھوں نے بطورِ خاص بھی نظمیں تخلیق کی ہیں اور معاشرے کے تہذیبی بانجھ پن یا ثقافتی انتشار کو بھی موسموں کی شدت کے ساتھ واضح کیا ہے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے ایلیٹ کی Waste Land کی طرز پر کئی ایک مصرعے تراش کر دشتِ بے آب و گیاہ کی تمثالیں بڑے منفرد اسلوب میں تراشی ہیں۔ اُن کی نظم "قیامت آگئی ہے" بھی اس سلسلے میں لائقِ توجہ ہے لیکن "[unclear] پہ یہ دشمنی کیوں کر رہے ہو؟" ایک الگ طرز کی نظم ہے اور اس کا مطالعہ کئی ایک سطحوں پر کیا جا سکتا ہے۔

اس نظم کو ملاحظہ کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر تحسین فراقی کے "خطبۂ صدارت" سے اُن چند سطور کو بھی دیکھ لیا جائے جو انھوں نے معاصر عالمی صورتِ حال کے تناظر میں ماحول دوستی کے سلسلے میں رقم کی ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

> "نامور پرتگالی ادیب ہوزے سارا ماگو (۱۹۹۸ء کا نوبل انعام یافتہ) نے ایک جگہ معاصر عالمی آشوب کو اندھے پن کی وبا سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے خیال میں یہ اندھا پن ہمیں اس بات کی رخصت دیتا ہے کہ ہم مریخ پر راکٹ بھیج کر وہاں کی چٹانوں کی تشکیلی ساخت کو جانچیں پرکھیں مگر اس کرۂ ارضی پر کروڑوں انسانوں کو بھوک سے مار دیں۔ سارا ماگو کی دانست میں یا تو ہم اندھے ہیں یا پاگل۔ سعدی نے یہی بات صدیوں پہلے برنگِ دیگر کہی تھی:

تو کار زمیں را نکو ساختی
کہ با آسماں نیز پرداختی؟

مارچ ۲۰۱۰ء میں معروف انگلستانی اخبار ڈیلی میل میں ایک جاذب عنوان کے تحت ایک خبر چھپی: "Slaughter of the Swans" ۔ خلاصہ یہ تھا کہ مشرقی یورپ کے مہاجروں کے ہاتھوں خوبصورت ہنسوں کا قتل عام ہو رہا ہے جو باعث تشویش ہے۔ پرندوں کے شکار کیے جانے پر اخبار نویس کی یہ تشویش قابلِ داد سہی لیکن خود اس کا ملک دیگر استعماری طاقتوں کے دوش بدوش خود انسان اور اس کی پُر ارزش تہذیب کی بربادی کی جو تاریخ رقم کرتا رہا ہے اور اب بھی بہت حد تک کر رہا ہے، اس کا حساب کون لے گا؟"(۳)

انجینئر! آخر رات تم نے ساتواں پُل بھی گرا ڈالا
کئی ہفتوں سے تم اس کام میں پیہم جٹے ہو
پُل پہ پُل اس شہرِ ہنر ساں کے ڈھاتے جا رہے ہو
اور سمجھتے ہو
کہ تم نے وقت کی رفتار پہلے سے زیادہ تیز کر دی ہے
انجینئر! یہ پُل ـــــ منہ کے بل گرتے ہوئے یہ منہدم پُل
تمھارے اور مرے پرکھوں، پرانے عقل والوں کی
کئی صدیوں کی پیہم سوچ کا حاصل ـــــ یہ پُل تھے
جن کو پل بھر میں تمھارے ہاتھیوں نے روند کر برباد کر ڈالا ہے
لیکن تم سمجھتے ہو کہ تم نے وقت کی رفتار پہلے سے زیادہ تیز کر دی ہے

معاصر اُردو نظم میں ڈاکٹر تحسین فراقی کی ان تخلیقات میں فکر اور اسلوب ہر دو سطح پر ایک نیا آہنگ سنائی دیتا ہے۔ یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ گذشتہ چند برسوں میں عالمی اور قومی سطح پر جن اہم تہذیبی تبدیلیوں نے جنم لیا ہے ان نظموں میں اُن کا نہایت بصیرت افروز تخلیقی اظہار ہوا ہے۔ یہ تخلیقات فکری طور دردمندی کا عنصر بھی رکھتی ہیں لیکن اسلوب کے لحاظ سے نشاط انگیز بھی ہیں۔ بہ طور مثال نئی معروضات کی آخری سطور پر میں "نئے سال کی پہلی نظم" کا اندراج

کروں تو مناسب ہوگا۔

بس یونہی دیر تک
بیتے لمحوں کے ہم جال بنتے رہے
اور پھر ایک دم
درد کی لہر اس زور سے دل میں ابھری کہ آنکھوں سے شبنم برسنے لگی
ایک پل کے لیے
بیتے لمحوں کے سب جال دھندلا گئے
برق چمکی تو ہم راستہ پا گئے
حال میں آ گئے

غزل اور نظم کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر تحسین فراقی نے بعض رباعیات بھی رقم کی ہیں، جن میں داخلی طرزِ احساس قدرے زیادہ حاوی محسوس ہوتا ہے۔

ایام بہار پھر نہیں آئیں گے
بچھڑے ہوئے یار پھر نہیں آئیں گے
اشکوں سے چھلکتی ہوئی پیاسی آنکھو!
وہ ناقہ سوار پھر نہیں آئیں گے

دزدیدہ نگاہی کا ہنر کافی ہے
رخسار کا اک پرتوِ زر کافی ہے
بن جائے گی پل بھر میں یہ مٹی سونا
بس، اک نگہِ کیمیا گر کافی ہے

ڈاکٹر تحسین فراقی کا شعری سرمایہ مقدار کے لحاظ سے اُن کی دیگر ادبی و تنقیدی نگارشات سے کم ضرور ہے لیکن فکر، اسلوب اور آہنگ کے لحاظ سے اس کے معیار سے انکار ممکن نہیں ہے اور اس امر میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ان کا فن اپنے اندر تاثیر کے متنوع تیور رکھتا ہے۔

منتخب کلام

کبھی حرا ، کبھی طیبہ دکھائی دیتا ہے
یہ خواب میں مجھے کیا کیا دکھائی دیتا ہے
کہیں سے اُن کی صدائے لطیف سنتا ہوں
کہیں پہ اُن کا سراپا دکھائی دیتا ہے
مسافرِ رہ بطحا ہوں ہر قدم پہ مجھے
حضورِ پاکؐ کا چہرہ دکھائی دیتا ہے
بشر تو ایک طرف اُن کی آتشِ غم میں
مجھے گہر بھی سلگتا دکھائی دیتا ہے
تری لطیف جمالی کا کون ہمسر ہو
کہیں صبا کا بھی سایہ دکھائی دیتا ہے
مرا حبیب رسولانِ دہر کی صف میں
کبھی کبھو تمہیں کیسا دکھائی دیتا ہے

○

میں ہر ایک بات کہاں کہاں نہیں بھولتا
مگر ایک شامِ فراقِ جاں نہیں بھولتا
وہ جو روز دیتا تھا صبحِ نو کی بشارتیں
وہ ہوا کا صحبۂ مہرباں نہیں بھولتا
وہ جسے بھلا کے مجھے تھا خود کو سنبھالنا
وہی ایک شامِ گلِ رخاں نہیں بھولتا
وہ جو چہرۂ جاں پہ بس ایک پل کو جلا بجھا
وہی اک شہابِ شررِ نشاں نہیں بھولتا

کبھی خواب میں کبھی رتجگوں کے عذاب میں
وہ ستارۂ سرِ کہکشاں نہیں بجھتا

○

جو شکلِ موم کفِ دست میں پگھلتا ہے
وہ لوحِ دار گہر کس صدف میں ڈھلتا ہے
چمن کے آب رواں گھر سے جب نکلتا ہے
کسی کا دل بھی سنبھالے نہیں سنبھلتا ہے
وہ میرے پاس نہیں، میرے دل کے پاس تو ہے
چراغ ایک ہے اور دو گھروں میں جلتا ہے
وہ رنگ و صوت کا آمیزۂ جنوں آموز
سوادِ جاں میں شب و روز آنکلتا ہے
یہ میرا خامۂ قدسی نفس ز روزِ ازل
بیاضِ دشتِ سخن میں گہر اگلتا ہے

○

نہاں نظر سے ہے اور دو بدو پکارتا ہے
یہ کون ہے جو مجھے چار سو پکارتا ہے
نہ اس سے رشتۂ جاں ہے، نہ اس سے ربطِ نظر
تو کس لیے اسے میرا لہو پکارتا ہے
یہ کس کی تیغ صفت لے فضا کو چیرتی ہے
یہ کون دل زدہ راتوں کو ہو پکارتا ہے
ہوا ہے ہجر میں وہ خوگرِ صدا ایسا
جو پاس بھی تو مجھے روبرو پکارتا ہے
عجیب شہرِ طلسم ست میں گھرا ہوں جہاں
ہر ایک حرف گلو دریدہ پکارتا ہے

عجب دوراہے پہ قسمت نے لا کے چھوڑ دیا
کہ ہم نفس ہے گریزاں، عدو پکارتا ہے
لکھی ہے دشت نوردی نصیب میں پھر سے
کوئی اسی کی طرح ہو بہو پکارتا ہے
صدائیں سلب ہوئیں کس مقامِ حیرت پہ
کہ میں پکارتا ہوں اور نہ تو پکارتا ہے

○

ستارۂ سحری تو جو ہم سفر ہو جائے
پلک جھپکتے میں یہ ہفت خواں بھی سر ہو جائے
بس ایک بار، نسیمِ سحر فقط اک بار!
مرا وجود مثالِ گلاب تر ہو جائے
ہجومِ گل بدنانِ صبا نفس کے لیے
چراغِ چشم جلے یوں کہ بس سحر ہو جائے
کسے خبر ہے، پسِ چرخ کتنے عالم ہیں
خبر کی خیر اسی میں، کہ بس نظر ہو جائے
بھلا رکھا ہے مجھے جس نے نام تک میرا
خدانخواستہ جادہ وہ بے اثر ہو جائے
مری مدد کو مرے آنسوؤ چلے آؤ
نواحِ جاں میں جگر مشتعل اگر ہو جائے

○

ترے فراق میں دل شعلۂ چنار ہوا
یہ رنگ زخم کھلا، تحفۂ بہار ہوا
شعاع، مہر سے نکلی تو دل کو چیر گئی
کماں سے تیر جو نکلا، جگر کے پار ہوا

رہا ہمیشہ زمانہ یونہی ضعیف آزار
جو پا پیادہ ہوا اس پہ یہ سوار ہوا
تم اس کے ہو کے بھی کیوں اس کے ہو نہیں پائے
سوال مجھ سے بھی ایک ، بار بار ہوا
کبھی بہ حالتِ گریہ بھی مسکرانے لگے
ہمارا خود پہ بس اتنا ہی اختیار ہوا

○

کس ندانست کہ آن ساقیِ بیدار کجاست
می پدید است ولی خانۂ خمار کجاست
گرمی ہست ولی مشقِ زبان ناپیدا
دہن ہست ولی شعلۂ گفتار کجاست
ما بہ صحرای جنون برہنہ پا می رقصیم!
ما چہ دانیم کہ ما را خلشِ خار کجاست
پای کوبان صفتِ کبکِ دری می پریم
ماو ما حلقہ و طوقِ رسن و دار کجاست
سیلِ بی مہر ز ایوان شکستہ پرسد
آن ہمہ سقف و ستون و در و دیوار کجاست
بہ لبم جان برسید است ، بیا زود بیا!
قاصدا ، نامہ برا! نامۂ دلدار کجاست
ہم چو تحسینِ فراق بہ زبان حاضر
دمِ حق بین وحق اندیش وحق اظہار کجاست

○

زچشم فتنہ گرش دانہ گیر پیداست
نگر کہ در فلکِ حیلہ باز ذر پیداست

خوشا کہ سال نوین مژدۂ وصال آورد
خوشا کہ بار دگر از شبی سحر پیداست
کرم نمود دگر بارہ آن غزال ختن
عجب کہ سرو سہی را دگر ثمر پیداست
نہ بازوی کہ حمائل کنم بہ گردن کیک
بہ گرد ماہ کمر ہالۂ دگر پیداست
چہ خضر رہ کہ مرا از سفر رہا کردست
چہ جنتی کہ ز پہنائی سفر پیداست
زدود زنگِ دلم را بہ یک الف صیقل
ہجوم نور کہ از خاور نظر پیداست
نگاہ ساقیِ سیمیں ذقن بچہ افگند
قمر زنی کہ ز پیدائیِ سحر پیداست
بہ صرصری کہ در آن شعلۂ صدا خسپد
بہ نیں نوای چراغی کہ از جگر پیداست

قائداعظم کی یاد میں

وہ کہ سبز پرچم کا سیم گوں ستارا تھا
چاندنی کی برکھا تھا ، روشنی کا دھارا تھا
فکر اس کی راتوں کا ، دیپ اس کی باتوں کا
نور اک سمجھنے سے مستعار لیتا تھا
وہ کہ جسم ظاہر میں تھا فقط ہیولی سا
قلب کا سمندر تھا ، فکر کا ہمالہ تھا
جس نے سال دس اپنے ساتھ بن گزارے تھے
اس کو غیر کا احساں کب بھلا گوارا تھا

وہ کہ جس نے دیس اپنا کل ابھی اُسارا تھا
دور دیس کی جانب جانے کیوں سدھارا تھا
آؤ نوکِ مژگاں پہ اس کی یاد سلگائیں
وہ کہ نوکِ خنجر پہ پا برہنہ چلتا تھا
آؤ یاد میں اس کی دیپ ہم جلائیں ، جو
مثلِ گیلی لکڑی کے رات دن سلگتا تھا
آؤ اس کے حرفوں کی لَو کو پھر کریں اونچا
جگنوؤں کی بستی کا جس نے اَول ڈالا تھا
تم بھی سچ سمجھتے ہو ، ہم بھی ٹھیک کہتے ہیں
وہ فقط تمھارا تھا ، وہ فقط ہمارا تھا

اے برادرِ چنگیز

جس طرح تگہ اُٹھے اپنی جگ ہنسائی ہے
دشت میں قیامت ہے ، شہر میں دہائی ہے
رہزنی و دزدی کی خیر سے بن آئی ہے
کس قدر بے سلائی ، کیسی خویش رائی ہے
اے برادرِ چنگیز
یاں ہے درسِ بدبینی ، واں ہے کینہ آموزی
ہر طرف سیہ شامی ، ہر طرف سیہ روزی
قتل و کشت و خوں ریزی ، خودکشی و خود سوزی
دیس میں ہے جوبن پر ان دنوں کٹھن روزی
اے برادرِ چنگیز
اس نجیب ملت کو تم سے جب پڑا پالا
تم نے اس کی غیرت کو کر دیا تہ و بالا

تم نے اس کو پہنا دی سامراج کی مالا
اور دیس کا آئین بوٹ سے کچل ڈالا
اے برادر چنگیز
سام کے اشارے پہ اک مشن ملا تم کو
تم مشن بجا لائے فخر ہے بجا تم کو
ڈالروں کی بارش کا جھٹ ملا صلا تم کو
زنگ دھل گیا سارا ، مل گئی جلا تم کو
اے برادر چنگیز
شرق کا جو تھا شاعر ، اُس کے خواب بولی میں؟
سر کٹے ہوئے اُن کے دشمنوں کی جھولی میں؟
سر بریدہ خوابوں کے جسم سرد کھولی میں؟
سڑ رہے ہیں اور تم سب ناچتے ہو ہولی میں؟
اے برادر چنگیز
سامراج کے ہمراہ ظلم پہ تم اتراتے ہو
جب وہ گال دے تم کو پھول پھول جاتے ہو
غلط داغ پہ ہر روز عظمتیں جتاتے ہو
راز راز ملت کا یار کو بتاتے ہو
اے برادر چنگیز
حریت ، شرافت کا خون کر دیا تو نے
در نصاب نورانی زہر بھر دیا تو نے
لے کے کچھ ڈرافٹ رج سے ، کیا گہر دیا تو نے
غیر کے تصرف میں گھر کا گھر دیا تو نے
اے برادر چنگیز

فردِ فروش کامی پہ دستخط یہ کس کے ہیں
شاہکار خامی پہ دستخط یہ کس کے ہیں
منظرِ غلامی پہ دستخط یہ کس کے ہیں
ذلتِ دوامی پہ دستخط یہ کس کے ہیں
اے برادر چنگیز

خانۂ خدا پہ بھی ترکتازیاں تیری
حرفِ آسمانی سے آہ ، بازیاں تیری
شیشۂ صبوحی سے رنگ قاضیاں تیری
اور یہود و ترسا سے دل نوازیاں تیری
اے برادر چنگیز

دشت دور میں دہشت ہے ہر گھر میں وحشت ہے
پاش پاش غیرت ہے ، تار تار عفت ہے
شیر دل کھیتوں کا دیس جائے عبرت ہے
پر ابھی ترے دل میں "اور کچھ" کی حسرت ہے
اے برادر چنگیز

شیر کو سبق دے مت گوسفند بننے کا
در مقابلِ اعدا شیر و تند بننے کا
مشک و عود و عنبر کو گوہ و گند بننے کا
خیر و صدق و برکت کو مکر و فند بننے کا
اے برادر چنگیز

عظمتِ دوامی تو ہے فقط نصیب اس کی
ذر حساب سے اس کے، ذات بے حسیب اس کی
بے خبر نہ ہو غافل ، ہے پکڑ قریب اس کی
ڈر خدا کی لاٹھی سے ، سخت ہے ضریب اس کی
اے برادر چنگیز

ن م راشد

زمستاں کی بارش میں بھیگے ہوئے
زمہریری ہواؤں میں ٹھٹھرے ہوئے
اور کیچڑ میں
دم تا دہن زور لتھڑے ہوئے
بھیڑیوں سے یہ ممکن کہاں۔۔۔
کوئی تازہ نخچیر بیدار پائیں
فقط ہے زمانے کے
نوخیز و تنومند و خونخوار شیروں کے بس میں
کہ وہ مار لائیں
گمان و یقیں کے گھنے جنگلوں میں
کوئی تازہ و نو شکار۔۔۔
شاہین وار۔۔۔!
فقط دردمندی سے لبریز رندوں کے خلاق ہاتھوں سے ممکن ہے
پل بھر میں وہ
نیست سے ہست کر دیں
نئے خم کدے اور نئے مے گسار
شکستہ خزف ریزہ ہائے قدح کو
بہ شکلِ صراحی کریں استوار
نئے برج و بارو نئے لالہ زار!
تو آئیں سوداگروں کے مبارک قدم سے
چمکنے لگیں ہر طرف ایک دم سے

نئے ہاٹ بازار کوچے ہزار
نئی بستیاں اور نئے شہر یار
بہار آفریں دسرا پا بہار
تماشہ گہ صد ہزار
نئے مرغزار اور نئے کوہسار!

رباعیات

میدے میں گندھا شباب دیکھا میں نے
جلتا ہوا ماہتاب دیکھا میں نے
دن کو کمرے میں روشنی برساتا
فوارۂ رنگ و آب دیکھا میں

○

جب وقت کے دریا میں چڑھی طغیانی
پھر کون رہے گا یاد کس کو جانی
آ! ان میں ڈوب کر امر ہو جائیں
یہ ساعتیں چند جو ہوئیں ارزانی

○

وہ بات کو چھوڑنا ادھورا تیرا
اک لمحے کو بھرنا وہ ہنگورا تیرا
دل کے ویراں فلک کو ہے یاد ابھی
روشن چہرے کا چاند پورا تیرا

حوالہ جات وحواشی

۱۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، انٹرویو، "ادبی ستارے" از عارف فتح خان، مکتبہ فروزاں، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۱۶۳-۱۷۵

۲۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، انٹرویو، ماہنامہ "سیارہ"، لاہور، جولائی اگست ۲۰۰۵ء، ص ۱۱۶

۳۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کی اس نظم کا ترجمہ جامعۃ الازہر کے شعبۂ اردو کے صدر نشین ڈاکٹر سید ابراہیم محمد ابراہیم نے عربی میں کیا ہے۔ ذیل میں ملاحظہ ہو:

انتظار

(۱)

غدونا من الانتظار تحجرت

ورؤوسنا كقمم الثلوج تجمدت

ولا يزال الخضرُ المنتظرُ

ممتطياً صهوةَ جوادٍ كالبرق الخاطف

متوارياً خلفَ الغبار

فشعاعُ ذلك النجم البعيد

لم يصلنا إلى الآن حرارة

(۲)

ونحنُ في صراعاتنا مستغرقون

وسرطانُ أنانيتنا ووثنيتنا

فقضى على كلِّ جوهرٍ بداخلنا

ولا تزالُ نعقد الآمال

على مجيء "طارق"، أو "غازي"

على مجيء "محوريّ العصر والأوان"

أو فاتحٍ أو سلطانٍ

كم من قرونٍ انقضت في هذا الوهم

أبداً ما فكّرنا، أبداً ما استوعبنا

أنّ زمن العصا السحريّة، واليد البيضاء

قد انتهى منذ عهدٍ بعيد

تلك العصا التي كانت

تُطلق الشلّال من الأحجار

أبداً لن تعود

لم يخطر ببالنا

كم هي ضعيفةٌ واهيةٌ

لُبُّ الأحلام

حيث تُطلّ الأسود الضارية

الغضبى على النجوم الميّتة

في هذه الدنيا

تُصبح الأفكار الميّتة

منذ متى سقطت أسنانُنا؟

ولم نعرف بذلك أقرانَنا المتهلّلة!

(٣)

وقفنا

"إذ كنّا نحفر في سقفنا"

خلف طريقها

منذ قرونٍ عديدة

بين رمال صحراء الجشع

منذ متى سقطت السيوف والخناجر من سواعدنا؟

سواعدنا المرتعشة

المتخاذلة

الكلمة

مُنذُ متى وآمالُ العابرة القاهرة

تَحمِلُ بَينَ يَدَيها "أحلامًا عديدةً"

تستجدي فيها من الغرب

"قرطاسًا أخضر"

أو تنتظرُ منه في الخفاء

"إشارةً خضراء"

والأجنّة المكدّسة المزعجة، ذات الشُّهور السّبعة

تهزُّ رؤوسها الضّعيفة الصّغيرة

وتنشدنا إليها

بمرايا أعينها الغائرة الباردة

هذه الأجنّة

ذات الشُّهور السّت والسّبع

تقودُ سُفُنَنا

التي فقدت ملاحيها وأشرعتها

إلى سرابٍ بلا نهاية

وما أخبرنا إلّا نسي

أن تنال هذه السّفن

إن عاجلًا أو آجلًا

لا بدّ وأنّ الغرق مصيرها

وما ينجو من السّراب

لا مفرّ

يغرق على السّاحل

۳۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، [illegible]، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۲۰۸۔۲۰۹

باب چہارم

ڈاکٹر تحسین فراقی اور فنِ ترجمہ کاری

ترجمہ اپنے باطن میں وسیع تر مفاہیم رکھتا ہے لیکن معروف معنی کسی ایک زبان کے متن کو کسی دوسری زبان میں ڈھالنے کے ہیں۔ ترجمہ نگار دو الگ الگ خطوں میں بولی جانے والی زبانوں کے متون میں ایک باہمی ربط پیدا کرتا ہے اور یوں تہذیبی طور پر اجنبیت کے دریا کا پاٹ عبور کرتے ہوئے ثقافتی و فکری ہم آہنگی کے اسباب مہیا کرتا ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی کی تخلیقی مساعی میں مذکورہ ہم آہنگی کا عمل بھی شامل ہے اور انھوں نے ترجمہ نگاری کا فریضہ مختلف جہتوں میں نبھایا ہے۔

"ترجمہ کیوں، کیسا اور کب؟" ان سوالات کا جواب تلاش کرنے کے لیے انھوں نے عبدالماجد دریابادی کی ترجمہ نگاری کے جائزے سے قبل ایک تفصیلی بحث کی ہے۔ جس میں عملِ ترجمہ کے بارے میں قابلِ قدر نکات کے ساتھ ساتھ مترجم کے فرائض بھی اجاگر کیے ہیں۔ اُن کے نزدیک:

> "ترجمہ دو زبانوں یا دو تہذیبوں کے درمیان ایک پل کا کام دیتا ہے اور مترجم کی حیثیت اصلاً ایک سفارت کار کی ہوتی ہے۔"(۱)

تہذیبی سفارت کا یہ عمل اپنے باطن میں جو باریکیاں، نزاکتیں اور دشواریاں رکھتا ہے، ڈاکٹر تحسین فراقی اُس سے بہ خوبی آگاہ ہیں اور انھیں اس امر کا ادراک ہے کہ

> "ترجمہ پھولوں کی سیج نہیں، کانٹوں کا بستر ہے۔ یہ کارزارِ عشق ہے۔ اس میں سوچ سمجھ کر اترنا چاہیے۔"(۲)

ترجمے کی مشکلات سے ڈاکٹر تحسین فراقی کی آگاہی عملی اور تنقیدی ہر دو سطح پر ہے۔ آپ کی تنقیدی کاوشوں میں بعض تراجم کے جامع تجزیات بھی شامل ہیں۔ اس سلسلے میں اُن کے درج ذیل مضامین لائقِ مطالعہ ہیں:

۱۔ این مری شمل بہ حیثیت غالب شناس ۔۔۔ چند معروضات (غالب۔ فکر و فرہنگ)

۲۔ آبِ حیات کا انگریزی ترجمہ (آزاد صدی مقالات)

۳۔ عبدالماجد دریابادی بہ طور مترجم و شارح (عبدالماجد دریابادی۔ احوال و آثار)

۴۔ بانگِ درا کا پہلا مکمل انگریزی ترجمہ (اقبال۔ دیدۂ بینائے قوم)

۵۔ انگریزی ترجمہ "کشف المحجوب" (نکلسن) پر ایک نظر (نکات)

مذکورہ بالا تراجم لسانی یا پیرایۂ اظہار کی نوعیت کے لحاظ سے مختلف النوع ہیں۔ بعض تراجم شعری کاوشوں کے ہیں جبکہ دیگر نثری کتب کے۔ اس طرح لسانی لحاظ سے ان کی درج ذیل نوعیتیں ہیں:

۱۔ عربی سے انگریزی

۲۔ فارسی سے انگریزی

۳۔ اُردو سے انگریزی

۴۔ انگریزی سے اُردو

مذکورہ بالا نوعیتوں کا ذکر اس اعتبار سے ناگزیر ہے کہ ان کی تفصیل سے ڈاکٹر تحسین فراقی کی مختلف زبانوں پر دسترس کا اظہار ہوتا ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے ترجمے کے سلسلے میں جو کاوشیں کی ہیں اُن کی درج ذیل نوعیتیں ہیں:

۱۔ علمی تراجم

۲۔ افسانوی ادب کے تراجم

۳۔ ادبی صحافت کے تراجم

۴۔ شعری ادب کے تراجم

متفرق موضوعات پر مبنی مضامین کے علمی تراجم کے سفر کا آغاز ۱۹۷۹ء میں ہوا اور تاحال ڈاکٹر تحسین فراقی کی یہ کاوشیں "مطالعۂ بیدل۔ فکرِ برگساں کی روشنی میں" اور "فکریات" کی صورت میں طبع ہو کر منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔

"مطالعۂ بیدل۔ فکرِ برگساں کی روشنی میں" علامہ محمد اقبال کے ایک نایاب مضمون "Bedil in the light of Bergson" کا اُردو ترجمہ ہے۔ اس مضمون کی نقل ڈاکٹر تحسین فراقی نے ڈاکٹر جاوید اقبال کی اجازت سے اقبال میوزیم سے حاصل کی اور اس کا متن پہلی بار ۱۹۸۶ء میں "اقبال ریویو" کے

شمارہ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا اور ۱۹۸۸ء میں یہ مضمون مع اُردو ترجمہ یونیورسل بکس، لاہور سے منظرِ عام پر آیا۔ بعدازاں اس کی اب تک تین اشاعتیں اقبال اکیڈمی، لاہور کے توسط سے سامنے آ چکی ہیں۔

اس مضمون کا فارسی ترجمہ تہران یونیورسٹی، ایران کے معروف استاد ڈاکٹر علی بیات نے کیا جو "مطالعہ بیدل در پرتو اندیشہ ہائے برگسوں" کے عنوان سے پہلے لاہور سے شائع ہوا اور یہ مضمون بعد ازاں تہران سے "حقیقت و حیرت" کے زیر عنوان ۲۰۱۹ء میں پرنیان خیال نے شائع کیا۔ مذکورہ مضمون "غزلیاتِ بیدل دہلوی" کی پہلی جلد میں بطور مقدمہ بھی شامل ہوا ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے وقتاً فوقتاً متفرق مضامین کے تراجم کیے۔ یہ مضامین موضوع اور مزاج کے لحاظ سے مذہب، فلسفہ، سماج اور ادب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۱۹۷۹ء سے آغاز ہونے والے تراجم کے اس سلسلے کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ "اختصاص کا وحشی پن": یہ مضمون آرتیگا۔ ای۔ گاسِت (Ortega Y-Gasset) کے مضمون "The Barborism of Specializatinin" کا ترجمہ ہے۔

۲۔ "حقیقت اور تاریخ": یہ مضمون آرتیگا۔ ای۔ گاسِت (Ortega Y-Gasset) کا مضمون "Primitivism and History" کا اُردو ترجمہ ہے۔ یہ دونوں مضامین اُن کی کتاب "The Revolt of the Masses" کا حصہ ہیں۔

۳۔ "ابنِ اسحٰق اور سیرتِ رسول": یہ مضمون ابنِ اسحٰق کی مرقومہ سیرتِ رسول کے اس انگریزی ترجمے کے دیباچے کا اُردو ترجمہ ہے جو الفریڈ گیوم نے کیا۔

۴۔ "روایت کا ایک ترجمان۔ رینے گینوں": یہ مضمون گائی اِٹن (سدی حسن الشاذلی) کی کتاب "The Richest Vein" کے ایک باب کے ایک حصے کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۹ء میں منظرِ عام پر آئی۔

۵۔ "مغربی دنیا کے چیلنج اور عالمِ اسلام": یہ مضمون سید حسین نصر کے انگریزی مقالے "The Western World and its Challenges to Islam" کا ترجمہ ہے۔ یہ مقالہ اُن کی کتاب "Islam and the Plight of Modern Man" کا حصہ ہے۔

۶۔ "تعلیم الادب اور مذہبی اقدار۔ اسلامی زاویۂ نگاہ": یہ مضمون پروفیسر سید علی اشرف کے مضمون

"Literary Education and Religious Values - an Islamic Approach"
کا ترجمہ ہے۔

۷۔ "کہیں اوٹ میں": یہ فکشن کے ممتاز عالمی نقاد میلان کندیرا (Milan Kundera) کی تحریر کے "Somewhere Behind" کا اُردو ترجمہ ہے جو اُن کی کتاب "The Art of the Novel" میں شامل ہے۔ اس تحریر کو Linda Asher کے انگریزی میں ترجمہ سے اُردو میں ڈھالا گیا۔

۸۔ "تعریفوں کا تصادم": یہ مضمون ایڈورڈ سعید کے مقالے "The Clash of Definitions" کا ترجمہ ہے جو سعید کی کتاب "Reflections on Exile" کا حصہ ہے۔

۹۔ "داستانِ سلامان و ابسال": یہ مضمون ڈاکٹر سید محمد حسینی کے فارسی مقالے کا ترجمہ ہے جو ایک قدیم یونانی داستان سے متعلق ہے۔

۱۰۔ "اک بحرِ پُر آشوب و پُر اسرار ہے رومی۔ پیش گفتار": یہ تحریر ممتاز جرمن مستشرق این میری شمل (Annemarie Schimmel) کی مولانا روم پر مرقومہ کتاب "The Triumphal Sun" کے پیش لفظ کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب کا فارسی ترجمہ "شکوہِ شمس" کے عنوان سے ہوا ہے۔ ترجمے کے عمل میں اس کتاب سے بھی ضروری استفادہ کیا گیا ہے۔

۱۱۔ اسی کتاب کے ایک مفصل دیباچے "The Outward Setting" کے غالب حصے کا اردو ترجمہ بہ عنوان "خارجی نقش گری" معاصر انٹرنیشنل لاہور کے ۲۰۱۰ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

۱۲۔ شمل کے پیش لفظ "The Brides of God" کا اردو ترجمہ "عرائسِ الٰہی" کے نام سے صحیفے کے شمارہ ۲۰۰۳۔۲۰۰۶ء میں شائع ہوا۔ مذکورہ پیش لفظ "My Soul in a Women" نامی شمل کی تصنیف میں شامل ہے۔

۱۳۔ "انتہاؤں کا اتصال": یہ مضمون مارٹن لنگز (ابوبکر سراج) کی کتاب "Ancient Beliefs and Modern Superstitions" کے آخری باب بہ عنوان "Meetings of Extremes" کا اردو ترجمہ ہے جو "مکالمہ" کراچی کے سالنامے شمارہ ۲۵ میں شائع ہوا۔

مذکورہ مضامین سوائے مؤخر الذکر تین تحریروں کے اُن کی کتاب "فکریات" میں شامل ہیں۔
ڈاکٹر تحسین فراقی کے مذکورہ علمی تراجم کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو ترجمے کے بعض تکنیکی اوصاف

کے ساتھ ساتھ موضوعات کے تنوع کا بھی احساس ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں اولیں لائق ذکر کاوش ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کا "مضمون "Bedil: In the light of Bergson" ہے جو اپنے اندر گہرے فکری مباحث سمیٹے ہوئے ہے۔ برگساں کی فکر اور بیدل کا اسلوب دو ایسے عناصر ہیں کہ انھیں زبانِ غیر کے پیکر میں ڈھالنا کوئی آسان امر نہیں ہے۔ بیدل کے بعض اشعار کا انگریزی ترجمہ کرتے ہوئے خود اقبال نے بھی دشواری محسوس کی اور اس کا اظہار بھی کیا۔ مثلاً بیدل کا شعر:

ہستی روش ناز جنوں تاز کہ دارد
می آیم از گردِ نفس بوئے خرامے

اقبال لکھتے ہیں:

"It is almost impossible to render the verse into English; I shall endeavour to explain the ideas embodied in it."[3]

ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس "مضمون کو اُردو قالب میں ڈھالنے کے عمل میں فلسفیانہ مباحث کی پیچیدگی کا ادراک کرتے ہوئے مصنف کے مافی الضمیر کو قاری تک پہنچانے کی جو سعی کی ہے اس میں ابلاغ کی سہولت اور علم کی حشمت ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔ اقبال، بیدل کی فکری افتادِ طبع کا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں:

"It is to the Bergsonian phase of his poetic thought that I want particularly to draw the attention of our students of Western philosophy. In our examination of Bedil's poetry, however, we should never forget the fact that it is unfair to expect a worked out system of metaphysics from a poet whose impatient mind cannot but pass over the infinitely varying aspects of an elusive Reality without undergoing the painful work of systematization. In Bedil the Bergsonian conception of Reality appears to be one among other views which the poet seems to try in the course of his spiritual development."[4]

اس کا ترجمہ ڈاکٹر تحسین فراقی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"بیدل کے افکارِ شعری میں جہاں جہاں برگسانی رنگ جھلکتا ہے اس کی جانب میں مغربی فلسفے کے طالب علموں کی توجہ خاص طور پر منعطف کرتا ہوں۔ البتہ بیدل کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ کسی ایسے شاعر سے مابعد الطبیعیات کے ایک مرتب اور منضبط نظام کی توقع لاحاصل ہی ہے جس کے بے چین ذہن کو ترتیب و تہذیب کے تکلیف دہ عمل میں پڑے بغیر ایک گریز پا حقیقت Reality کے بے انتہا مختلف پہلوؤں سے صرفِ نظر کرنے کے سوا چارہ نہیں۔ بیدل کے یہاں ان کے دیگر خیالات و نظریات کے ساتھ ساتھ ایک تصور وہ بھی ہے جسے برگساں کا تصورِ حقیقت کہنا چاہیے اور جس کا تجربہ شاعر اپنی روحانی ترقی کے مرحلے میں کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔" [illegible]

ڈاکٹر تحسین فراقی نے متن کے اصل مفہوم تک رسائی کے لیے اپنے ترجمے میں بعض الفاظ کے لغوی معنی سے گریز بھی کیا ہے۔ مثلاً Polyphonic کا لفظی ترجمہ کثیر الاصوات ہے جبکہ انھوں نے اس کا ترجمہ کثیر الجہات کیا ہے۔

فلسفیانہ یا علمی ترجمے میں معنوی گہرائی کے باعث اصطلاحات کا ترجمہ مشکل ہی نہیں پیچیدہ بھی ہوتا ہے۔ اکثر اوقات اصطلاح کا ترجمہ تو کر دیا جاتا ہے لیکن کسی فکری ابہام یا ایہام سے گریز کی خاطر اصل لفظ بھی قوسین میں دے دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اصطلاحات کے ترجمے میں علمی مفہوم کے ابلاغ کو اہمیت تو دی ہے لیکن ایک خاص علمی حشمت کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ اس سلسلے میں چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

Becoming (تکوّن)، مرورِ محض (Pure Duration)
Completed whole (مکمل کرۂ کل)، Not Yet (ہنوز)
Spatialise (مبدل بہ مکان)، Psychic Rush (نفسی ریلے)

برگساں کے فلسفے میں حرکتِ حیات ایک بنیادی نکتہ ہے اور اس نکتے کی روشنی میں اقبال نے کلامِ بیدل کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ مطالعہ اُن کاوشوں کا تسلسل ہے جو عجمی تصوف کے زیرِ اثر جامد تصورِ حیات کے

خلاف فکری طور پر جاری تھیں۔ اقبال چونکہ حرکتِ حیات کے قائل ہیں لہٰذا انھوں نے ضروری خیال کیا کہ بیدل کے تصورات کو نظریہ برگساں کی روشنی میں دیکھتے ہوئے حرکت اور تسلسلِ عمل کو فروغ دیا جائے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنے ترجمے میں اقبال کے اس سارے مطمحِ نظر کو پیشِ نظر رکھا ہے اور فلسفیانہ مباحث کی علمی سطح کو بھی ملحوظ رکھا ہے لیکن دوسری طرف ابلاغ میں پیچیدگی پیدا نہ ہونے کے پہلو کا بھی لحاظ رکھا ہے۔ مثلاً اقبال لکھتے ہیں:

> "If movement is supposed to be the essence of life, it is obvious that it must be regarded as original and absolute. Otherwise time would cease to be real. Movement thus regarded would be identical with time itself. And this is exactly what we find in a number of verses wherein the poet guards us against the idea of an unreal time which our mathematical understanding powders up (to use a Bergsonian expression) into moments.."[6]

ان سطور کا ترجمہ ڈاکٹر تحسین فراقی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> "اگر حرکت حیات کا جوہر ہے تو یہ واضح ہے کہ اسے اصلی اور مطلق قرار دینا چاہیے بصورتِ دیگر زمان بحیثیت ایک حقیقت کے باقی نہیں رہے گا۔ حرکت کا یہ مفہوم قرار دینا اسے زمان کے ہم معنی بنانے کے مترادف ہے۔ ٹھیک یہی خیال ہمیں ان متعدد اشعار میں ملتا ہے، جہاں شاعر ہمیں غیر حقیقی زمان کے تصور سے متنبہ کرتا ہے جسے ہماری ریاضیاتی سوچ برگسانی اصطلاح میں "غبارِ لمحات" کی شکل دے دیتی ہے۔"[6]

ڈاکٹر تحسین فراقی کے دیگر علمی تراجم موضوع کے لحاظ سے متنوع ہیں اور فکری طور پر مذہب، تہذیب، سماج، شعر و ادب اور اقبالیات سے تعلق رکھتے ہیں۔

ان تراجم میں بھی وہ اوصاف نمایاں ہیں جو بیدل سے متعلق اقبال کے مضمون کے ترجمے میں نظر آتے ہیں۔ اُن کی اوّل و آخر یہ کوشش رہی ہے کہ متن کا ترجمہ نفسِ مضمون کی لسانی فضا کے ساتھ ساتھ علمی معیار کا بھی روشن مظہر ہو۔ قاری اُسے پڑھتے ہوئے اُس علمی ترفع سے بھی آشنا ہو جو مصنف کے

معیارِ علمی نیز موضوعِ بحث کی اہمیت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں دو متن کے ساتھ ساتھ تو چلتے ہیں لیکن اس ہم قدمی میں زبان اور بحث کے علمی زرس کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ ذیل میں ان کے تراجم کی دو مثالیں ملاحظہ ہوں:

"What, then, can be said about Rumi from the view-point of a modern interpreter? The response of our students to his verses is absolutely positive, although his poetry seems to offer difficulties to those who have not lived long enough with him. His language many times breaks the borders of normal Persian imagery. In Rumi's ghazals there is nothing of the nicely trimmed gardens of Shiraz which we like to take for the very essence of the Persian ghazal. His verses resemble rather the miniature paintings in Turcoman style with their almost incredible movement of flowers, bushes, demons, and animals than the well organized perfection of Bihzadian painting. Rumi's wide reliance upon a vocabulary taken from everyday life, and his switching from one topic to another without apparent logical sequence tends to confuse the readers at first; but the strong rhythm (which is part of the cosmic dance) always carries them away and helps them finally to overcome the obstacles."[8]

"سوال یہ ہے کہ جدید شارح کے زاویۂ نگاہ سے رومی کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے؟ اس ضمن میں ہمارے طلبہ کا جواب قطعی مثبت ہے گو کہ رومی کی شاعری ان لوگوں کے لیے مشکلات پیدا کرتی ہے جنھوں نے اس کے ساتھ ایک عرصہ گزاری ہو۔ ان کی زبان اکثر فارسی کی معمول کی تمثال کاری کی حدود کو توڑتی ہے۔ رومی کی غزلوں میں شیراز کے آراستہ و پیراستہ باغوں کا، جنھیں ہم عزیز

رکھتے ہیں اور فارسی غزل کا جوہر اصلی گرداننے ہیں، کوئی سراغ نہیں ملتا۔ ان کی شاعری بہزاد کی اعلیٰ تربیت یافتہ کامل مصوری کے بجائے ترکمانی اسلوب کی اس خیالی تصوری سے مماثل ہے جس میں پھولوں، چمنوں، دیووں اور جانوروں کی ناقابل یقین حرکت کے آثار موجود ہوں۔ رومی کے روزمرہ زندگی سے اخذ کردہ لغات پر وسیع انحصار اور ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی جانب بظاہر بغیر کسی منطقی تسلسل کے گریز کے سبب قاری اول اول پریشان ہو جاتا ہے لیکن اس شاعری کا پرشوکت و قوت آہنگ (جو اصلاً کائناتی رقص کا ایک حصہ ہے) ہمیشہ اُسے اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے اور آخر آخر اسے مذکورہ مشکلات پر غالب آنے میں مدد دیتا ہے۔"(4)

"Needless to say our ancestors were aware of the existence of other religions besides their own; but dazzled and penetrated as they were by the great light shining directly above them, the sight of more remote and - for them - more obliquely shining lights on the horizons could raise no positive interest nor did it create problems. Today, however, those horizons, are no longer remote; and amidst the great evil which results from all that has contributed to bring them near, some good also has inevitably stolen its way in."(10)

"اس بات کا سبھی کو علم ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد اپنے مذہب کے علاوہ دیگر مذاہب کے وجود سے بے خبر نہ تھے، لیکن چوں کہ ان کے اپنے مذہب کا خیرہ کن آفتاب عین ان کے سروں پر چمک رہا تھا، اس لیے کہیں دور بہت دور آفاق پر چمکنے والے اجرام ان کے لیے نہ تو کسی مثبت دل چسپی کا باعث بن سکے اور نہ کسی طرح کے مسائل پیدا کر سکے، لیکن آج وہ آفاق ہم سے زیادہ دور نہیں رہے۔ اگرچہ اس بڑی برائی کے بیچ جس کے نتیجے میں مذاہب ایک دوسرے

کے قریب آ گئے ہیں، کسی قدر غیر نے بھی ناگزیر طور پر اپنی جگہ پیدا کر لی ہے۔"(۹)

علمی ترجمے کے سلسلے میں ڈاکٹر تحسین فراقی اصل متن کے ضروری حواشی کا اہتمام بھی کرتے ہیں جن میں بعض ضروری توضیحات رقم کرتے ہیں۔ "نظریات" میں شامل تراجم میں ترجمے سے قبل مصنفین کے بارے میں تعارف بھی رقم کیا گیا ہے جس میں ان کے علمی کارہائے نمایاں کے حوالے سے آگہی فراہم کی گئی ہے۔

ترجمے کے سلسلے میں ڈاکٹر تحسین فراقی کی دیگر خدمات کے ذکر سے قبل محمد سلیم الرحمٰن اور ڈاکٹر خورشید رضوی کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے جن سے انھوں نے تراجم کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً معاونت طلب کی اور مشاورت کرتے رہے۔

افسانوی ادب کے تراجم کے سلسلے میں ڈاکٹر تحسین فراقی کی دو کتب منظر عام پر آ چکی ہیں۔ مذکورہ دونوں کتابیں فارسی ادب سے ترجمہ کی گئی ہیں اور ان کے مولف مہدی آذر یزدی ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے یہ کتب بچوں کے ادب سے تعلق رکھتی ہیں اور درج ذیل عنوانات سے منظر عام پر آئی ہیں:

۱۔ "بے زبانوں کی زبانی حکمت بھری کہانیاں"

۲۔ "اچھے بچوں کے لیے اچھی کہانیاں"

یہ امر بطور خاص لائق ذکر ہے کہ یہ دونوں کتب ڈاکٹر تحسین فراقی نے قیام ایران کے دوران میں ایرانی طلبہ و طالبات کو اردو پڑھانے کے لیے تدریسی نقطۂ نظر سے ترجمہ کی ہیں۔ ایک اور پہلو یہ بھی لائق بیان ہے کہ ان کہانیوں کے کردار چرند پرند ہیں۔

فارسی ادب سے ان تراجم کی نوعیت علمی تراجم سے اس اعتبار سے بہت حد تک مختلف ہے کہ یہ بچوں کے لیے رقم کردہ کہانیاں ہیں۔ ان کا اختتام کسی اخلاقی پہلو پر ہوتا ہے۔ لہٰذا ترجمے کے عمل میں مذکورہ پہلو کا خیال رکھنا ناگزیر تھا۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنے تراجم میں موضوع اور مقصد ترجمہ کا کس حد تک لحاظ رکھا ہے۔ اس کے لیے درج ذیل اقتباسات اور ان کے تراجم ملاحظہ ہوں:

"روزی بود، روزگاری بود. یک دسته از گنجشکها در صحرایی زندگی می کردند و در زیر بته های علف تخم

گذاشته بودند و جوجه در آورده بودند. یک فیل هم در آن صحرا زندگی می کرد و یک روز که فیل می خواست برود لب رودخانه آب بخورد سر راهش چند تا از جوجه های گنجشک را زیر پای خود له کرد.

گنجشکها خبردار شدند و خیلی غصه دار شدند و هریکی چیزی گفتند. یکی گفت "سرنوشت اینطور بوده". یکی گفت "چاره ای نیست باید بسوزیم و بسازیم". یکی گفت "دنیا همیشه پر از بدبختی است". ولی یک گنجشک که بیش از همه دلدار بود و اسمش کاکلی بود گفت "من هیچکدام از این حرفها را قبول ندارم. من می گویم صحرا جای زندگی است و خیلی هم خوب است ولی زندگی باید حساب داشته باشد و فیل نباید جوجه های گنجشک را لگد مال کند."

گنجشکها گفتند: "خوب، نباید بکند ولی حالا میکند، ماباید جای خودمان را عوض کنیم و برویم یک جایی که فیل نباشد."

کاکلی گفت: "این که نمی شود. پس هر کسی تا یک دشمن داشت فرار کند برود جای دیگر؟ این صحیح نیست، ماباید از حق خودمان دفاع کنیم، اینجا وطن ماست و ماباید آن را از شر دشمن حفظ کنیم. چرا ما جای خودمان را عوض کنیم؟ فیل راه خودش را عوض کند!"

گنجشکها گفتند: "حرف حسابی است ولی چه کسی می تواند این حرف را به فیل بزند؟"

کاکلی گفت: "همین ماها، مگر ما حق زندگی نداریم؟ می رویم به فیل اخطار می کنیم که حق ندارد توی این بته زار بیاید."(۳)

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کسی صحرا میں چڑیوں کا ایک خاندان رہتا تھا۔ انھوں نے گھاس پھونس میں انڈے دیے تھے جن سے بچے نکل آئے تھے۔ ایک ہاتھی کا بھی اسی صحرا میں بسیرا تھا۔ ایک دن ہاتھی اپنی پیاس بجھانے کے لیے دریا کی طرف جا رہا تھا کہ گھاس سے گزرتے ہوئے وہ چڑیوں کے چند بچوں کو کچل کر آگے نکل گیا۔ جب چڑیوں کو اس سانحے کا علم ہوا انھیں شدید صدمہ پہنچا اور ہر ایک نے اس سانحے پر اپنے اپنے الفاظ میں تبصرہ کرنا شروع کیا۔ ایک بولی: "قسمت میں یہی لکھا تھا۔" دوسری بولی: "کوئی چارہ نہیں، بس جلیں اور تباہ کریں۔" تیسری بولی "دنیا ہمیشہ سے بدبختی کا گھر ہے۔" ایک چڑیا جوان سب سے مختلف تھی اور بڑی ہوشیار تھی اور جس کا نام کاکلی تھا، بولی: "مجھے آپ لوگوں کے ایک حرف سے بھی اتفاق نہیں۔ صحرا زندگی گزارنے کا ایک مقام ہے اور بہت عمدہ ہے۔ لیکن زندگی کے لیے حساب اور احتساب بھی لازمی ہے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ کوئی ہاتھی آیا اور چڑیا کے بچوں کو پاؤں تلے روندتا ہوا چلا جائے"
چڑیاں یک زبان بولیں "واقعی اُسے ایسا نہیں کرنا چاہیے لیکن فی الحال وہ ایسا ہی کر رہا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم یہاں سے ایسی جگہ کوچ کر جائیں جہاں ہاتھی نہ ہو۔"
کاکلی بولی: "یہ نہیں ہوگا اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جس کسی کا کہیں دشمن ہو وہ وہاں سے راہِ فرار اختیار کر کے کہیں اور چلا جائے؟ یہ درست نہیں۔ ہمیں اپنے حق کا دفاع کرنا چاہیے۔ یہ جگہ ہمارا وطن ہے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم دشمن کے شر سے اسے بچائیں۔
ہم اپنی جگہ کیوں چھوڑیں، ہاتھی کوئی دوسرا رستا کیوں اختیار نہیں کرتا؟"
چڑیاں بولیں: "بات تو درست ہے لیکن یہ بات ہاتھی سے کہے کون؟"
کاکلی بولی: "ہمیں کہیں گے، کیا ہمیں زندگی گزارنے کا حق نہیں؟ چلیں ہم ہاتھی کو متنبہ کرتے ہیں کہ اسے ہماری حدود میں آنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔" (۱۳)
"یک روز شیر پرهیزکار با گروهی از درندگان برای گردش و تماشا به صحرا رفته بودند و ناگهان یک شتر را دیدند که سرگردان و تنها در بیابان می رود. گرگ و پلنگ و خرس و

درندگان دیگر که همراه شیر بودند و مدتی بود گوشت نخورده بودند گفتند: "این شتر از جنس ما نیست و گوشتش بر ما حلال است." دور شتر را گرفتند و خواستند او را بخورند. اما شیر پرهیز کار گفت: "نه، شتر حیوان زحمتکش و نجیبی است. حالا هم که از قافله اش گم شده و به چنگ ما افتاده باید او را گرامی بداریم تا او در پناه عدالت ما به خوشی زندگی کند."(۴۳)

"ایک روز پرہیزگار شیر درندوں کے ایک گروہ کے ساتھ صحرا کی سیر کے لیے نکلا۔ اچانک انھیں ایک اونٹ نظر آیا جو آوارہ اور تنہا وہاں پھر رہا تھا۔ بھیڑیا، چیتا اور ریچھ اور دوسرے درندے جو شیر کے ہمراہ تھے اور جنھوں نے مدت ہوئی گوشت کا منہ نہ دیکھا تھا، کہنے لگے: "یہ اونٹ ہماری جنس سے نہیں اس لیے اس کا گوشت ہم پر حلال ہے۔" وہ اونٹ کے اردگرد جمع ہو کر اسے کھا جانے کو تیار ہو گئے لیکن پرہیزگار شیر نے کہا" نہ ایسا نہ کریں۔ اونٹ ایک محنتی اور شریف جانور ہے۔ اب جب وہ اپنے قافلے سے بچھڑ کر ہمارے ہاں آ نکلا ہے، ہمیں چاہیے کہ اس کو خوش آمدید کہیں تا کہ وہ ہماری پناہ میں خوشی خوشی زندگی بسر کرے۔"(۴۴)

دی گئی امثال سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ ترجمہ کرتے ہوئے اسلوب کو عام فہم رکھنے کا بطور خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔ تحریر کے اندر ابلاغ نیز تدریسی عمل کے مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے ڈاکٹر تحسین فراقی نے الفاظ کے ساتھ ساتھ جملوں کی ساخت میں بھی سادگی برقرار رکھی ہے۔ تاہم بعض مقامات پر الفاظ کی نوعیت بچوں کے فہم سے بالا بھی نظر آتی ہے۔

ایران میں قیام کے دوران میں ڈاکٹر تحسین فراقی بچوں کے ادب کے تراجم کے ساتھ ساتھ ممتاز اُردو شاعر ن م راشد کے بعض مصاحبے جو انھوں نے ایرانی اخبارات و جرائد کو دیے تھے، دریافت کر کے انھیں اُردو ترجمے کے ساتھ منظر عام پر لے آئے۔

مذکورہ مصاحبے ایرانی جرائد "سپید و سیاہ" اور "فردوسی" میں شائع ہوئے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے قیام ایران کے دوران میں ان کی نقول حاصل کیں۔ ان کے تراجم شعبۂ اُردو جامعہ پنجاب کے تحقیقی مجلّہ

"بازیافت" میں بالترتیب شمارہ نمبر ۱۳، ۱۴، ۱۱ اور ۱۹ میں شائع ہوئے اور بعدازاں اُن کی کتاب "حسن کوزہ گر" میں یک جا ہو کر منظرِ عام پر آئے۔

ان مصاحبوں کا ترجمہ کرتے ہوئے ڈاکٹر تحسین فراقی نے متن کے لفظ بہ لفظ ترجمے کو اہمیت دی ہے اور راشد کے مافی الضمیر کے ساتھ ساتھ اسلوبِ گفتگو کا بھی لحاظ رکھا ہے۔ منوچہر آتشی سے گفتگو کرتے ہوئے ن م راشد نے اقبال کے بارے میں کہا:

"پس از ایشان مهمتر از همه ی شاعران اردو زبان بی شک اقبال است. اقبال پیرو سنت های آزاد و حالی بود اما جنبه ی فلسفی شعر او و آگاهی او از واقعیات اجتماعی و سیاسی زندگانی مسلمانان در سراسر جهان بیشتر است. درونمایه ی بنیادی شعر او این است که مسلمانان در جهان امروز، در راه رهائی و بدست آوردن حقوق خود، می باید ذات یا "من" خود را احیاء و نیرومند سازند، به خود بیشتر اعتماد داشته باشند. وروش های کهنه ی محتاطانه. اما کاهلانه ی. مبارزه با مشکلات خود را ترک گویند. اما او بامادیت امروزین مخالف بود و بر آن بود که معنویت دیروزین هنوز آخرین چاره گر درد ها و بدی های انسان است. اقبال در بسیاری از شاعران اردو زبان امروز تاثیر کرده است، اما این شاعران هیچیک به اوج فلسفی او نرسیده اند. ولی به رغم این تاثیر گسترده ی اقبال، باید بگوییم که در شعر امروز اردو بواکنش هائی دانسته یا ندانسته نیز بر ضد اقبال بر میخوریم."(۲۹)

ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا:

"اقبال آزاد اور حالی کی روایتوں کا پیرو تھا لیکن اس کی شاعری کی فلسفیانہ جہت اور پوری دنیا کے مسلمانوں کی اجتماعی اور سیاسی زندگی سے آگاہی مقابلتاً خاصی زیادہ ہے۔ اس کی شاعری کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ معاصر دنیا کے مسلمانوں کو اپنی

> موجودہ [ذلت آمیز] زندگی سے نکلنے اور اپنے حقوق کی بازیافت کے لیے اپنی ذات کا عرفان حاصل کرنا ہوگا۔ انھیں اپنی ذات پر اعتماد حاصل کرنا چاہیے اور اپنی زندگی کے کہنہ و متذبذب لیکن کاہلانہ طریقوں کو، اپنی مشکلات کے ساتھ مبارزہ کر کے، ترک کر دینا چاہیے۔ اقبال اپنے زمانے کی مادہ پرستی کا مخالف تھا اور اس کا موقف تھا کہ ماضی کی معنویت اب بھی انسانی دکھوں اور مشکلوں کی آخری چارہ گر ہے۔ اقبال نے آج کے اُردو کے بیش تر شاعروں پر اپنے اثرات چھوڑے ہیں لیکن ان میں سے کوئی ایک شاعر بھی اس کی فلسفیانہ رفعت تک نہیں پہنچا۔ اقبال کے ان وسیع اثرات کے باوجود مجھے کہنا ہے کہ جدید اُردو شاعری میں اقبال کے خلاف دانستہ یا نادانستہ ردِعمل بھی دکھائی دیتا ہے۔"(۱۸۰)

دیگر تراجم کی طرح ن م راشد کے مصاحبوں کے سلسلے میں بھی ڈاکٹر تحسین فراقی نے بعض اہم حواشی بھی رقم کیے ہیں جن میں بعض مغالطوں کو دور کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے نثری تراجم کے ساتھ ساتھ شعری ادب کے بعض منظوم تراجم بھی کیے ہیں۔ اگرچہ یہ مقدار کے لحاظ سے بہت کم ہیں لیکن معنوی تاثیر سے بھرپور ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے اقبال کی فارسی مثنوی "پس چہ باید کرد" کے بعض حصوں کے آزاد منظوم ترجمے کیے ہیں۔ اس کے علاوہ زینوفینیز کی نظم اور امریکی شاعر والٹ سوانسو کی ایک مناجات کو بھی انھوں نے اُردو کا روپ دیا ہے۔ یہاں آزاد ترجمے سے مراد معنوی اور ہیئتی دونوں ہیں یعنی ترجمے میں جہاں ایک طرف مجموعی فکر معنوی کو سامنے رکھتے ہوئے آزاد ترجمہ کیا گیا ہے وہاں ہیئتی اعتبار سے بھی آزاد نظم کی ہیئت استعمال کی گئی ہے۔

فنِ ترجمہ نگاری کے سلسلے میں ڈاکٹر تحسین فراقی کی مذکورہ مساعی اس حقیقت کا واضح مظہر ہیں کہ وہ اس عمل میں ہمہ جہت اسلوب میں متحرک رہے ہیں۔ وہ ادبی تراجم کے ایک نکتہ رس پارکھ بھی ہیں اور عملی طور پر بھی اس بحر میں ایک ماہر تیراک کے طور پر اترے ہیں۔ فنِ ترجمہ پر اُن کی کمال دسترس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اُردو کے علاوہ فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں کا لسانی شعور بھی رکھتے ہیں اور ان زبانوں کے ادبی رس سے بھی آگاہ ہیں۔

ادبی خدمات کے سلسلے میں ڈاکٹر تحسین فراقی جہاں دیگر تخلیقی و تنقیدی حوالوں سے معتبر ہیں وہاں فنِ ترجمہ میں بھی اُن کا اعتبار اور وقار بلند ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، عبدالماجد دریابادی۔ احوال و آثار، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور، دوسرا ایڈیشن، ۲۰۰۶ء، ص ۱۸۳

۲۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، انٹرویو، ادبی ستارے از عارفہ صبح خان، مکتبۂ شعر و ادب، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۱۹۹

۳۔ علامہ محمد اقبال، "Bedil: In the light of Bergson" مشمولہ: "مطالعۂ بیدل۔ فکرِ برگساں کی روشنی میں" ترتیب و ترجمہ: ڈاکٹر تحسین فراقی، اقبال اکادمی، پاکستان، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۴۴

۴۔ ایضاً، ص ۴۰

۵۔ ایضاً، ص ۴۹

۶۔ ایضاً، ص ۴۶

۷۔ ایضاً، ص ۳۶

8. Annemarie Schimmel, "The Triumphal Sun", Fine Book, London, 1978, Page.xi

۹۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، تحریرات، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۴۸۰

10. Martin Lings (ابوبکر سراج الدین), "Ancient Beliefs and Modern Superstitions", Unwin PaperBacks, London, 1980, P.70

۱۱۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، "آج ادب کا تسلسل"، مکالمہ فروری تا اگست، ۲۰۱۹ء، ص ۲۳۱

۱۲۔ مہدی آذر یزدی، "قصہ ہائے تازہ از کتاب ہائے کہن" سازمان انتشارات اشرفی، چاپ پنجم، ۱۹۹۳ء، دفتر سوم، ص ۴۱، ۴۲

۱۳۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، "بے زبانوں کی زبانی" ادارہ مطبوعات سلیمانی، لاہور، تیسرا ایڈیشن، ۲۰۰۹ء، ص ۳۹-۴۰

۱۴۔ مہدی آذر یزدی، "قصہ ہائے خوب برائے بچہ ہائے خوب (قصہ ہائے مرزبان نامہ)"، اکتیسواں ایڈیشن، ۲۰۰۶ء، ص ۵۶

۱۵۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، "اچھے بچوں کے لیے اچھی کہانیاں" ادارہ مطبوعات سلیمانی، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۸۱

۱۶۔ ن م راشد، "حسن کوزہ گر"، از ڈاکٹر تحسین فراقی، شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۸۳

۱۷۔ ایضاً، ص ۸۴

ناقدین کی آرا

ڈاکٹر تحسین فراقی کا تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی سفر بڑا زرخیز اور کثیر الجہتی کا مظہر ہے۔ انھوں نے اپنی نگارشات کو ایک خاص فکری سمت سے آشنا کرتے ہوئے تہذیبی عمل سے ہم آہنگ کیا ہے۔ کسی تخلیق کار کی فکری وفنی کاوشیں اگرچہ کسی ستائش کی تمنا یا صلے کی پروا کے بغیر ہوتی ہیں لیکن جوہری کسی گوہر آبدار کے لیے حرف توصیف رقم کرنے میں کسی پس وپیش سے بھی کام نہیں لیتے۔

ذیل میں اہل فکر و نظر کی وہ آرا ملاحظہ ہوں جو ڈاکٹر تحسین فراقی کی شعری تخلیقات، تنقیدی نگارشات، تحقیقی مساعی اور دیگر ادبی کارہائے نمایاں کے بارے میں کلمہ حق کے ساتھ ساتھ نقد و احتساب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

○

"خواجہ الطاف حسین حالی کی ایک مرصع غزل کا یہ مطلع خصوصی طور پر بہت معروف ہے:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

اس شعر میں جستجو کو لفظاً اور معناً مرکزی حیثیت حاصل ہے اور جہاں تک ڈاکٹر تحسین فراقی کی تخلیقی ذات کا تعلق ہے، ان کے یہاں بھی لفظ جستجو بڑا اہم رول ادا کر رہا ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کے بارے میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے۔ کہ انھوں نے بہت کم مدت میں اردو ادب کو اتنا کچھ دے دیا ہے کہ ان کی تیز رفتاری پر مسرت سے زیادہ حیرت ہوتی ہے۔

موجودہ دور میں فارسی شاعری اور فارسی ادب سے بہت حد تک بے اعتنائی اختیار کی جا رہی ہے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ لسانی اور ادبی اعتبار سے اردو کی جڑیں فارسی ادب و شاعری میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ آج بھی فارسی شاعری کی تشبیہات، استعارات، روایات ہم اردو شعر و ادب میں

بے تکلفانہ استعمال کر رہے ہیں۔ ایسے ماحول میں ایسی تکلیف دہ صورت حال میں کچھ ایسے افراد بھی نظر آجاتے ہیں جن کا فارسی ادب و شعر سے شغف زندہ ہے۔ انھی افراد میں تحسین فراقی کا بھی شمار ہوتا ہے اور مجھے دیکھ کر مسرت انگیز حیرت ہوئی کہ تحسین نے جہاں کہیں بھی انھیں مناسب موقع ملا ہے، فارسی اشعار سے استشہاد کیا ہے۔ بیدل کے تو وہ عاشق ہیں۔ بیدل سے ان کی یہ گرویدگی اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ انتخاب بیدل کو بھی اپنے مستقبل کے پروگرام میں شامل کرلیں۔ جناب عباداللہ اختر اور محترم ڈاکٹر غنی کے بعد اس کام کی توقع پروفیسر مرزا منور اور ڈاکٹر تحسین فراقی سے کی جاسکتی ہے اور کی جانی چاہیے۔

ہمارے پرانے تذکرہ نگاروں کی تحریروں میں مختلف شاعروں پر رائے زنی کرتے ہوئے فصاحت اور بلاغت کا استعمال عام ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں تحسین فراقی کے ہاں فصاحت تو ہے ہی مگر جس چیز کو بلاغت کہا جاتا ہے وہ بہت نمایاں ہے۔ شاعر کو لفظوں کی گہری مزاج شناسی کا جو ہر حاصل ہے۔ ان کا اسلوب بلیغ ہے۔۔۔ تحسین فراقی ایک خلاق ذہن کے مالک ہیں۔ ان کی تخلیقی کارگاہ سے جو ساز و سامان برآمد ہوتا ہے اس کا اپنا حسن، اپنی انفرادیت ہے۔"

(میرزا ادیب)

"تاریخ ادب میں تنقید اور تحقیق کے شعبے دو ایسے دھاروں کی مانند ہیں جو بالعموم تو متوازی صورت ہی میں چلتے ہیں، مگر گاہ گاہ یہ ایک دوسرے کی معاونت کرتے نظر آتے ہیں۔ تاہم یہ امتزاج معدودے چند اہل قلم کے ہاں نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کا شمار ایسے ہی خال خال امتزاجی نقادوں اور محققین میں ہوتا چاہیے۔ فراقی صاحب نے اقبال اور غالب کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی بیسیوں مضامین لکھے۔ یہ مضامین ادب کی مختلف اور متنوع اصناف سے بحث کرتے ہیں۔ شاعری، ناول، مزاح، سفرنامہ اور تنقید۔ ان مضامین کو پڑھتے ہوئے تنقید ادب کا ایک نیا ذائقہ محسوس ہوتا ہے، ایک ایسا ذائقہ، جو دوسروں کی پسند و ناپسند سے بے نیاز اپنی انفرادی جہت کو یا انداز و گر پیش کرتا ہے۔"

(ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی)

"تحسین فراقی نے ابتدا سے اپنی شخصیت کی تعمیر میں چند ایسی باتوں کا لحاظ رکھا ہے جس سے ادبی فضا رفتہ رفتہ محروم ہوتی جا رہی ہے۔ پہلی چیز جو ان کے ہاں سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ ان کا علم ہے۔ اُردو کے ساتھ ساتھ فارسی شاعری کا گہرا مطالعہ اور ان سے منسلک علوم پر نظر، عربی ادب سے دلچسپی، فلسفے اور نفسیات کا فہم، دنیا بھر کی نظریاتی تحریکوں کا علوم و فنون پر اثر۔ یہ اُن کے مطالعے کے بنیادی شعبے ہیں اور یہ دلچسپی ان کی تحریروں میں ایک گہرے ہوتے ہوئے پس منظر کی طرح جھلکتی ہے اور ہر بیان کے معنویتی ڈھانچے میں ایک تیسری جہت پیدا کرتی ہے۔ مضامین کے اس مجموعے [جستجو] میں جو چیزیں شامل کی گئی ہیں وہ کم و بیش ہمارے آج کے ادبی اور تخلیقی تجربے کے Context پر زیادہ زور دیتی ہیں۔

اقبال کے سلسلے کے مضامین، اکبرالٰہ آبادی پر مضمون اور جدیدیت کا جائزہ ایسی تحریریں ہیں جو اگر ایک طرف ان کے وسیع تناظر کی شہادت دیتی ہیں تو دوسری طرف انھیں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پورے تہذیبی سفر میں وہ کن نقطہ ہائے نظر کو اہم اور قابلِ توجہ سمجھتے ہیں۔ ان مضامین میں ہمیں تہذیبی معنویت کا وہ فہم دکھائی دیتا ہے جس کی بنیاد ایک بہت گہری تجزیاتی فراست پر ہے۔ اپنے نقطۂ نظر کو مختلف سطحوں پر بیان کرنا، ان سطحوں کے درمیان ربط کو قائم رکھنا پھر ایک وسیع علمی پس منظر سے اس کے لیے شہادتیں مہیا کرنا ایک واضح ذہن اور خصوصی علمی نقطۂ نظر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

عام طور پر نقاد کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار بہت حد تک ایک چیز پر ہوتا ہے جسے ہم Sense of Relevance کہہ سکتے ہیں۔ یعنی اس بات کا احساس کہ اس کے زمانے کے تخلیقی تجربے میں کون کون سی چیزیں بنیادی رول ادا کر رہی ہیں۔ چنانچہ اس حوالے سے تحسین نے اپنے لیے آج کی دنیا کا اہم ترین سوال چن لیا ہے۔

ہماری انفرادی، ادبی اور تہذیبی زندگی میں روایت کی کیا اہمیت ہے؟ تحسین کی تنقید اس سوال کو اپنا مرکز بناتی ہے اور اس حوالے سے اپنے تناظر عالم کی تشکیل کرتی ہے۔ یہ ایک ایسا اہم سوال ہے جس کی تفتیش ادبی تجربے کی معنویت سے لے کر پوری زندگی کی معنویت کو محیط ہے چنانچہ یہی وجہ ہے تحسین کی تحریروں نے بہت جلد ایک ایسی اہمیت حاصل کر لی جو دوسرے لوگوں کو ایک عمر کی مشقت کے بعد ملتی ہے۔ اس سارے عمل میں تحسین کو بنیادی طور پر مدد اپنے شعری تجربے، اپنے علم اور زندگی کو دیکھنے کے ایک بامعنی رویے سے ملی ہے۔ کسی عہد کے بنیادی مسائل سب سے پہلے شعری تجربے میں ہی ظاہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسی لیے دیکھا گیا ہے کہ تخلیقی ادب سے عملی تعلق نہ رکھنے والے نقاد عموماً جب محض

نظریہ ساز فلسفے کے حوالے سے تخلیقی ادب کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان سے مضحکہ خیز قسم کی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ شعری تجربے نے تحسین کو مسائل پر ایک منفرد گرفت عطا کی ہے۔

ان تمام باتوں سے ماورا ایک شے اور بھی ہے جس نے تحسین کی تنقید کو اس پورے دور کے تخلیقی سیاق و سباق میں بہت اہم اور بامعنی بنا دیا ہے۔ میرے نزدیک وہ مسلم کلچر کے ادبی تجربے کی ایک توسیع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ان کا طرزِ احساس بنیادی طور پر ایک گہرے مذہبی تجربے سے تشکیل پاتا ہے۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ ہمارے شعری اور افسانوی ادب میں جو اہم چیزیں اس وقت ظاہر ہو رہی ہیں ان کی تہہ میں بھی ایک گہرا مذہبی طرزِ احساس کام کر رہا ہے اور اپنی نسل میں تحسین فراقی اس پورے طرزِ احساس کے اہم ترین نمائندے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی مذہبی طرزِ احساس سے اس مملکت کی تخلیقی معنویت کو سمجھنے کی جہت پیدا ہوتی ہے۔

تحسین کے ہاں یہ مسئلہ بنیادی طور پر ایک تہذیبی مسئلہ ہے اور ان کے پورے ادبی کیریئر میں اس کی بہت اہمیت ہے۔ ہر نسل اپنا نقاد ساتھ لے کر آتی ہے۔ اگرچہ کہ اس کتاب میں کوئی ایسا مضمون شامل نہیں ہے جو بلاواسطہ طور پر نئی نسل کے بارے میں لکھا گیا ہو لیکن ان کا پورا طرزِ احساس اور سمتِ سفر واضح طور پر یہ اشارہ کرتا ہے کہ تہذیبی سیاق و سباق کو سمجھنے کے بعد ان کا موضوع یقیناً وہ نقطۂ نظر اور اس سے پھوٹتا ہوا تجربہ ہوگا جس سے وہ خود کئی سطحوں پر مربوط ہیں۔

تحسین فراقی کی تنقید کا ابتدائی مرحلہ ہی موضوعات پر ان کی گرفت، علم، تجزیاتی فراست اور سب سے بڑھ کر دیانت کی جہت سے انھیں اتنا اہم بنا دیتا ہے کہ مستقبل میں ان سے عہد آفریں اور رجحان ساز تحریروں کی توقع بہت ذمہ داری سے کی جانے لگی ہے۔"

(سراج منیر)

"نقاد لوگ بمشکل ہی اچھے شاعر ہوتے ہیں۔۔۔ اب تحسین فراقی کا مجموعہ (شاخِ زریاب) ہاتھ آیا تو نام مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں نے ڈرتے ہوئے سوچا، یہ بھی نقاد شاعر یا شاعر نقاد کی قبیل کا مجموعہ ہے، لیکن کتاب کے ورق اُلٹے تو ہوش اڑ گئے۔

واللہ یہ شاعری ہے۔ 'نعتیہ شہرِ آشوب' جیسا کلام مومن کے بعد نظر نہیں آیا تھا۔۔۔ مومن جیسی قادر الکلامی نہ سہی، استعارے کا اتنا وفور نہ سہی لیکن انداز وہی ہیں، جوش وہی ہے، دل وہی ہے اور دل

کا درد وہی ہے۔ اسی طرح جوان بیٹے کی موت پر جو نظمیں ہیں، ان کی قوت، ان کا درد، ان کی بلاغت
درجۂ کمال تک پہنچی ہوئی ہے۔۔۔ فارسی کا کلام تھوڑا سا ہے لیکن برجستہ ہے۔ تھوڑا بہت ہم سبک ہندی
والوں کا رنگ ہے، کچھ خسرو کے یہاں سے خوشہ چینی کی ہے، نتیجہ خوشگوار ہے۔"

(شمس الرحمٰن فاروقی)

"تحسین فراقی شعر بھی اچھا کہتے ہیں اور اخبار کے کالم بھی خوب لکھتے ہیں۔ اب ان کی تازہ
کتاب [جستجو] کے مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ وہ ادبی تنقید کا بڑا قابلِ تحسین شعور بھی رکھتے ہیں۔ ہر چند
کہ ان کا شمار، بساطِ تنقید پر "واردانِ تازہ" کے زمرے میں ہوتا ہے لیکن مجھے یقینِ کامل ہے کہ اگر
انھوں نے غالب کے پورے قطعہ کو ذہن میں رکھا "گوشِ نصیحت نیوش" سے کام لیا اور چشم کو ہر رنگ
میں وا رکھا تو سرِ دست وہ "فغانی" رہ کر بھی بہت جلد "ظہوری" کے مدِ مقابل بن جائیں گے۔
کتاب کے موضوعات کا تنوع اور موضوعات کو برتنے کا اُسلوب صاف ظاہر کرتا ہے کہ نظریاتی کا
کمٹ منٹ کے باوصف ان کے یہاں وہ کلاسک اندازِ فکر موجود ہے جس سے ادب اور ادیب کے تادیر زندہ
رہنے کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ مجھے یہ روشنی تحسین فراقی کے یہاں واضح طور پر نظر آتی ہے۔"

(ڈاکٹر فرمان فتح پوری)

"تحسین فراقی نے بہت کم عرصے میں اُردو تنقید میں اپنے لیے ایک منفرد مقام پیدا کر لیا ہے۔ اس
کا سبب یہ ہے کہ ادب اور تنقید سے اُن کا تعلق کسی مصلحت پر مبنی نہیں ہے۔ وہ اُردو ادب کے مخلص اور
سنجیدہ قاری ہیں اور ادبی مسائل پر مخلصانہ اور سنجیدہ انداز میں سوچتے ہیں۔ اُنھوں نے ادب اور متعلقہ
سماجی علوم کا وسیع مطالعہ کیا ہے، اسی سے اُن کی تنقید میں وہ گہرائی پیدا ہوتی ہے جو پڑھنے والوں کو مزید
سوچنے اور کسی نتیجے تک پہنچنے میں مدد دیتی ہے۔
اُردو کی موجودہ تنقید دو انتہاؤں کے درمیان سانس لے رہی ہے۔ ایک طرف صرف جملے بازی کو تنقید
سمجھ لیا گیا ہے اور دوسری طرف "کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی" کے منشور پر عمل کیا جا رہا ہے۔ اس صورتِ حال
میں جن چند نقادوں نے توازن اور اعتدال کی روشن مثال قائم کی ہے، اُن میں تحسین فراقی بھی شامل ہیں۔"

(مشفق خواجہ)

''تحسین کی تنقید کا سب سے بڑا کمال ٹھیک ٹھیک نشانے پر تیر مارنا اور ہدف کو ہر وقت نگاہ میں رکھنا ہے۔ ترکش سے تیر نکالتے ہوئے، شست پر بٹھاتے ہوئے، چلہ چڑھاتے ہوئے، تیر چھوڑتے ہوئے ہدف ان کی نگاہ سے اوجھل نہیں ہوتا اور یہ دوسرے نقادوں کی طرح موضوع کے کرے سے سینٹری فیوگل باہر نہیں جا پڑتے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑی مشکل بھی ان کی راہ میں ہے کہ انھوں نے ادب اور بہت سے متعلقہ سماجی علوم کا وسیع مطالعہ کر رکھا ہے جو ان کے تعین کی راہ میں تلون پیدا کرتا ہے۔ اصل میں اگر ایک ہی معیار سامنے ہو تو یکسوئی کی نعمت عطا ہوتی ہے۔ ہر ایک جگہ سے معیار کے نمونے پسند اور ناپسند کرتے پھرنا اور ان کی ترتیب و تدوین میں لگے رہنے سے بے چینی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔''

(اشفاق احمد)

''ڈوئنگ نے کہیں کہا تھا کہ جدید تر انسان دیکھنے میں روایتی نظر آتا ہے۔ کوئی ایسا ذریعہ ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا کہ شعری روایت سے رشتہ قائم کیے بغیر نئی شاعری کی جا سکے۔ فراق صاحب کی کتاب میں اردو شعری روایت کے بہت سے پہلو بیک وقت سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے بظاہر تو جدید اور قدیم کا سوال نہیں اٹھایا مگر انھوں نے اس دور کا ایک سرا ضرور پکڑنے کی خواہش کی ہے جو ماضی میں دور تک چلی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ پتنگ کا تعلق بھی ہے جو فردا کے آسمان پر اپنے رنگ دکھائے گی۔''

(شہزاد احمد)

''ڈاکٹر تحسین فراقی اُردو ادب کے ایک زیرک ادیب، صاحب نظر نقاد اور حقیقت کے متلاشی محقق ہیں، ان سب جہات میں غالباً ان کے شاعر ہونے کی صلاحیت نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ ان کے باطن میں ایک تخلیقی فنکار اور معاشرے کو گہری نظر سے دیکھنے والا شاعر موجود ہے، جو اپنا اظہار کرتا ہے تو زندگی اور وجود میں ایقان ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ صالح اور صادق قدروں پر بھی ایمان مستحکم ہو جاتا ہے۔۔۔ تحسین فراقی وجود کو مادے کا بوجھ نہیں بناتے ہیں بلکہ اس کے داخل میں روح کی عظمت کو بھی تسلیم کرتے ہیں اور اس کی طہارت کے داعی بھی ہیں۔''

(ڈاکٹر انور سدید)

"تحسین فراقی ایک ذہین اور متوازن مزاج نقاد کی حیثیت سے اُبھرے ہیں۔۔۔علم کی وسعت اور موضوع پر ان کی گرفت، یہ وہ صفات ایسی ہیں جن کی وجہ سے ان کی تنقید میں گہرائی اور پختگی نمایاں نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تنقید میں ایک مخصوص تجزیاتی فراست ہے۔"

(ڈاکٹر معین الدین عقیل)

"تحسین فراقی مختلف شعری اصناف مثلاً غزل، پابند نظم، آزاد نظم، نعت، رباعی وغیرہ کو اس مہارت سے لکھنے پر قادر ہیں۔ اگرچہ ان کے کلام پر عموماً کلاسکیت کا پرتو دکھائی دیتا ہے مگر اس کے باوجود یہ جدت سے محروم نہیں۔ ان کے ہاں اسلوب کہیں معرب و مفرس ہے اور کہیں سلیس مگر اہم بات یہ ہے کہ کہیں بھی ناہموار نہیں۔ وہ اپنے دل میں قومی اور ملی درد رکھتے ہیں۔ اس لیے ان موضوعات پر بھی اچھی نظمیں تخلیق کرنے میں کامیاب رہتے ہیں مگر ان کی غزلیات میں ایک الگ دنیا آباد ہے جس میں اپنی شخصیت کے حقیقی انعکاس کے ساتھ ساتھ کائناتی فکر بھی جلوہ گر ہے اور حوادث روزگار کے نقوش بھی جابجا دکھائی دیتے ہیں۔"

(ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا)

اک ارادت ہے ہم کو دونوں سے
اک عراقی تھا، اک فراقی ہے
اوّل الذکر ایک صوفی تھا
نام جس کا جہاں میں باقی ہے
ثانی الذکر اس زمانے میں
بزمِ نقدِ سخن کا ساقی ہے

(انور مسعود)

''تحسین فراقی کو تنقید لکھنے میں ایک سہولت یہ حاصل ہے کہ وہ خود بہت اچھا شاعر ہے، چنانچہ ایک شاعر جب تنقید لکھنے بیٹھتا ہے تو وہ اسے بے وزن نہیں ہونے دیتا۔۔۔ تحسین فراقی کے پاس چونکہ ویژن موجود ہے چنانچہ جب وہ تنقید کا ترازو ہاتھ میں پکڑتا ہے تو وہ اپنے تعصبات کو باٹ کے طور پر استعمال نہیں کرتا۔''

(عطاالحق قاسمی)

''ڈاکٹر تحسین فراقی کو شبلی®نی کے پہلو میں بٹھانے کی جسارت نہیں کر سکتا لیکن ان دونوں شاعروں میں مجھے کئی دلچسپ مماثلتیں نظر آتی ہیں۔ یہ مماثلت اس وجہ سے اور بھی نمایاں نظر آتی ہے کہ دونوں حضرات واضح طور پر دینی رجحانات رکھنے والے اہلِ قلم میں ہیں۔''

(پروفیسر جعفر بلوچ)

''تحسین فراقی کی تنقید میں تجزیاتی بصیرت نمایاں کردار ادا کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ خیالات، افکار، حالات، شخصیات، اشیا اور عوامل کو ایک وسیع تناظر میں رکھ کر دیکھنا اور کہیں جوڑ کر اور کہیں باہم ٹکرا کر ان سے نتائجِ فکر اخذ کرنا، ان کی تنقید کا ایک ایسا وصف ہے جو فی زمانہ نایاب نہیں تو کم یاب کے درجے میں تو بہر حال آ چکا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا مذہبی شعور، تصورِ تہذیب اور نظریۂ تاریخ ان کے ادبی افکار کی تشکیل میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے ذریعے ادب کی معنویت اور اس کے فہم کی جو صورتیں ان کے یہاں وضع ہوتی ہیں اور ان کے ہاں تنقید کا جو ڈسکورس قائم ہوتا ہے، وہ تحسین فراقی کے انتقادی سلسلۂ خیال کو نقطۂ آغاز سے حاصلِ مطالعہ نتائج تک کو روشن کرتا چلا جاتا ہے۔''

(مبین مرزا)

''پروفیسر ڈاکٹر تحسین فراقی اُردو زبان و ادب کا وہ عظیم نام ہے جو اُردو زبان و ادب کے آسمان پر روشن ستارے کی طرح ضوفشاں ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کی یونیورسٹیوں کے علاوہ دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں اُردو زبان و ادب پڑھنے اور پڑھانے والے ان کے نام سے بخوبی واقف ہیں۔ مصر، ترکی اور ایرانی جامعات کے ساتھ ساتھ مغربی جامعات میں اُردو زبان و ادب کے میدان میں ڈاکٹر

تحسین فراقی ایک معروف اور جانی پہچانی شخصیت ہیں۔

ان کی تصنیفات و تحقیقات سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ ان جامعات میں اُردو پڑھنے اور پڑھانے والوں کی کثیر تعداد نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، چاہے براہِ راست آپ سے یا پھر آپ کی کتابوں کے ذریعے۔ میں بھی ان خوش نصیبوں میں سے ہوں کہ مجھے بھی اللہ نے براہِ راست ڈاکٹر صاحب سے سیکھنے کی توفیق دی۔

میں ان کے اخلاق، علم اور زندہ دلی سے بہت متاثر ہوا۔ پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج کے شعبہ اُردو میں (ایم اے کے مرحلے میں ۱۹۸۸ء-۱۹۸۹ء) مجھے اُردو زبان و ادب پڑھایا اور میں نے ان کی نگرانی میں ایم اے اور پی ایچ ڈی (۱۹۹۰ء-۱۹۹۳ء) کے مقالات مکمل کرنے کا شرف حاصل کیا۔ یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے جس پر مجھے ناز ہے اور رہے گا۔ میں آج تک آپ سے استفادہ کرتا ہوں اور میری اللہ سے دعا ہے کہ استاد اور شاگرد کا یہ رشتہ ہمیشہ مضبوط اور قائم و دائم رہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی ایک کثیر الجہات شخصیت کے مالک ہیں۔ ایک عظیم استاد، جید شاعر، ماہر ادیب، گہری نظر رکھنے والے نقاد، زیرک مترجم اور سب سے بڑھ کر ایک رقیق القلب، باہمت اور اعلیٰ عزم کے مالک انسان ہیں۔ آپ ہر ایسے آدمی کی مدد سے کبھی نہیں کتراتے جس کو آپ کی مدد کی ضرورت ہو چاہے وہ مانگے یا نہ مانگے۔ یہ ان پر اللہ کا فضل ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے یہ فضل عنایت کرتا ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی انتہائی حاضر جواب، بلا کے ذہین و فطین اور زندہ دل انسان ہیں۔ ان کو اُردو، فارسی اور انگریزی پر عبور حاصل ہے۔ انھی زبانوں میں ان کی بلند پایہ تخلیقات ہیں۔ آپ عربی زبان میں بھی شد بد رکھتے ہیں۔ انھیں عربی سے محبت ہے اور اس کی قدر و منزلت سے خوب آگاہ ہیں۔ اسی لیے کئی سال پہلے جامعہ الازہر نے ڈاکٹر صاحب کی شعری و نثری تخلیقات کو شعبۂ اُردو کلیہ اللغات والترجمہ اور شعبۂ اُردو کلیہ الدراسات الانسانیہ کے نصاب میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا اور آج مصر میں اُردو پڑھنے اور پڑھانے والے ڈاکٹر تحسین فراقی کے نام سے بخوبی واقف ہیں، ان کے علم و فضل سے استفادہ کرتے ہیں اور ان کی تصنیفات و تحقیقات کو پڑھتے ہیں۔

ان کی تخلیقات پر ایم اے اور پی ایچ ڈی کے مقالات تیار کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت شعبۂ اُردو کلیہ دراسات انسانیہ کی سکالر (یسرا اسماعیل) اپنا ایم فل کا مقالہ ڈاکٹر تحسین فراقی کے شعری مجموعے (شاخِ زرِیاب) پر لکھ رہی ہے۔ اور مجموعے کا عربی میں ترجمہ بھی کر رہی ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب سے میرا رشتہ ایک ایسا علمی و تہذیبی رشتہ ہے جو کئی سال سے قائم ہے اور ہمیشہ کے لیے قائم رہے گا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے علم و فضل اور رفعتِ مقام میں اضافہ کرے اور لمبی عمر کے ساتھ صحت و تندرستی عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین!"

(پروفیسر ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم المصری)

"تحسین فراقی نے تجربات کے سفر در سفر کے بعد جو نگار خانہ سجایا ہے وہ زندگی کے رنگا رنگ نقوش کی جانب اشارے دیتا ہے اور حقائق اشیاء کی ایسی تصویر کشی کرتا ہے جس سے بصیرتوں کو تازہ ذائقے ارزانی ہوتے ہیں۔ تحسین فراقی نے جس طرح غزل میں سات رنگوں کے چھینٹے دیے ہیں اسی طرح نظم کو بھی گہرے شعوری بانکپن سے مالا مال کیا۔"

(پروفیسر سیف اللہ خالد)

"تحسین فراقی کا اسلوبِ شعر گوئی اپنے سینے سے روایت کو لگائے ہوئے ہے اور ساتھ ہی ساتھ جدیدیت سے بھی ہم کنار ہے۔ ان کی شاعری میں خیال انگیز جذبہ اور جذبہ لبریز خیال دونوں ہی آپ کو پوری آب و تاب کے ساتھ ملیں گے۔ ان کی نظم اور غزل دونوں ہی بہت خوب ہیں لیکن مجھے ان کی غزل کے سحر نے زیادہ اپنی گرفت میں لیا۔"

(رضی مجتبیٰ)

"تحسین فراقی کے تخلیقی سفر میں حسی کیفیات کی آگہی اور بصیرت کی وسیع دنیائیں آباد ہیں۔ ان کا جوہرِ تخلیق فنِ شعر کی نزاکتوں کے ساتھ ساتھ خیال کی ندرت اور تازگی سے مملو ہے۔۔۔۔ وہ علمی اور ادبی تحقیق اور تدریسی مشاغل کے باعث شعر گوئی کی طرف کم توجہ دیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں فراقی صاحب اگر اپنی فرصتوں کو شعری اظہار سے منور کریں گے تو دنیائے فن منفرد امکانات سے آشنا ہوگی۔"

(حفیظ الرحمٰن خان)

"نفسیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ بے چینی اپنی تسکین چاہتی ہے اور ادب کے ماہرین فرماتے ہیں کہ شاعری بھی ایک ذہنی اضطراب اور خلش کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اس لیے یہ بھی ایک بے چینی ہے۔۔۔ ان کے کلام کی پختگی اور فن شاعری میں ان کی مہارت اس حقیقت کی غماز ہے کہ وہ اقلیم سخن میں دور تک اور دیر تک سیاحی کرتے رہے ہیں۔۔۔ جو فنی اور اسلوبی تجربے انھوں نے کیے ہیں وہ پُر [illegible] بھی ہیں اور ایک خاص اہمیت کے حامل بھی ہیں۔۔۔ موضوعات کا تنوع اور ایک جداگانہ شعری آہنگ پیش کیا ہے جو قاری کو ایک پُر مسرت حیرت میں مبتلا کر دیتا ہے اور وہ لفظوں میں چھپی ہوئی معنی آفرینی پر بے ساختہ واہ کہہ اٹھتا ہے۔"

(عابد انصاری)

"ڈاکٹر تحسین فراقی کا شعری مزاج ان کے تخلیقی شعور کے ترفع، فکری بالیدگی اور گہری شاعرانہ بصیرت کا مظہر ہے مگر اس سے یہ اخذ یا گمان بے معنی ہوگا کہ ان کی شاعری شعریت سے خالی ہے۔ شعریت کے بغیر تو شاعری کا امکان ہی رد ہو کر رہ جاتا ہے۔ جہاں محض خالی موزونیت شاعری قرار نہیں دی جا سکتی وہاں اس حقیقت کو دیکھنے میں بھی کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیے کہ محض شعریت بھی اچھی شاعری کا معیار نہیں ہو سکتا [سکتی]۔ اچھی شاعری وہی ہے جس میں فکر کا عنصر اپنی پوری طاقت کے ساتھ موجود ہو۔ فراقی صاحب کے ہاں یہ دونوں عناصر اپنے بھرپور ادغام کے ساتھ موجود ہیں، بلکہ اس پر مستزاد یہ کہ ان کی تخلیق کا مقصد اولیں نظری طور پر تعمیری ہے جو ان کی طبیعت کی میانہ روی اور راست فکری سے ظہور کرتا ہے۔"

(خالد علیم)

"ڈاکٹر تحسین فراقی کا شمار بھی ستر کی دہائی میں سامنے آنے والے نقادوں میں ہوتا ہے۔ تحسین فراقی اپنی تنقید میں مذہب سے وابستگی کی بنا پر تخلیق کار سے ایسے ادب کا مطالبہ کرتے ہیں جو اپنے اندر زندگی کی مثبت قدروں کا اثبات لیے ہوئے ہو۔ کلاسیکی اُردو اور فارسی ادب کے گہرے مطالعے نے ان کی تنقید میں ایک ایسا رچا ہوا شعور پیدا کیا ہے جو ان کے ہم عصر نقادوں میں خال خال نظر آتا ہے۔ تحسین فراقی تنقید اور تحقیق ہر دو میدانوں میں اپنے جوہر دکھا رہے ہیں۔

تحسین فراقی کی تنقید ایک رچے ہوئے شعری و ادبی مزاج کی غمازی کرتی ہے۔ وہ بطور نقاد اپنے موضوع کا تجزیہ مختلف جہات سے کرتے ہیں۔ اپنے موقف کے حق میں دلائل دیتے ہیں، مثالیں پیش کرتے ہیں اور اس سارے عمل میں وہ ایک پختہ فکر نقاد کی طرح قاری کو اپنے ساتھ چلاتے ہیں۔ کسی جگہ قاری پر حاوی ہونے یا اس پر اپنے خیالات ٹھونسنے کی کوشش نہیں کرتے۔ یوں ان کے بارے میں بآسانی کہا جا سکتا ہے وہ ایک بالغ نظر، پختہ فکر اور زیرک نقاد ہیں۔"

(ڈاکٹر ضیاء الحسن)

"ڈاکٹر تحسین فراقی ان کمیاب لوگوں میں سے ہیں جن کے لیے علم بذاتہ محبوب ہے۔ ان کی نگاہ محض جدید میں الجھ کر کلاسیکی ادب سے ناآشنا نہیں رہ گئی ہے بلکہ انھوں نے کلاسیکی ادب کے گہرے مطالعے سے اپنے فن میں رچاؤ پیدا کیا ہے۔ وہ پنجاب یونیورسٹی میں اُردو زبان و ادب کے استاد رہے ہیں اس لحاظ سے اُردو ادب سے ان کا تعلق واضح ہے لیکن ان کا شوق مطالعہ اُردو زبان و ادب کی حدوں سے بہت آگے تک پھیلا ہوا ہے۔۔۔ شعر کا شعر میں ترجمہ کرنے کے لیے شعری صلاحیت کے ساتھ وسعت مطالعہ اور غیر معمولی ذخیرۂ الفاظ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ تحسین فراقی چونکہ ان دونوں صفات سے ↑ ہیں اس لیے وہ اس میدان میں کامیاب رہے ہیں۔۔۔ کہیں اسلوب کہیں لفظیات میں تحسین فراقی کے ہاں کلاسیکیت کا پرتو ہر جگہ دکھائی دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ کلاسیکیت کا ایک اور جوہر تغزل بھی ہے جو زمانہ حاضر کی غزل میں عصری شعور سے مل کر سوا ہو گیا ہے۔"

(ڈاکٹر زاہد منیر عامر)

"شاعر ہمارے تہذیبی وجود کا منظر نامہ بدلنے کی آرزو میں تپتی ہوئی تاریخ کا درد اپنی روح کے پاتال میں اُتار لیتا ہے اور شاعری کے پیکروں میں تلاش اور کرب گوندھ دیتا ہے۔ نئے شعر کی تلاش شاعر کو نامعلوم راستوں پر لے گئی ہے۔ تخلیقی سفر کے لیے لمحہ بہ لمحہ تبدیل ہوتی ہوئی حالتیں مختلف اصناف شعر میں تخلیقی ہلچل پیدا کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ یہ تخلیقی انداز نامعلوم چیزوں کو معنوی تنوع عطا کرتا ہے جس کا سبب شاعر کے ہاں تخلیقی تجربے کی صورت میں احساس اور شعور کی شدت ہے۔۔۔ ان کی غزل کا ایک نمایاں پہلو حسن و عشق کا مضمون ہے جو رومانوی طبیعت کا نتیجہ ہونے کے بجائے انسانی وجود

کی عمیق تہوں سے پھوٹتا ہے۔ شاعر محبوب کو Aesthetic Object کے طور پر قبول کرتے ہوئے عمل تطہیر سے گزرتا ہے اور تطہیر کا یہ عمل شاعر کو انسانی سرشت کی ماہیت اور اصلیت کے ساتھ ساتھ جہان کی اصلی سرشت سے بھی آشنا کر دیتا ہے۔۔۔ تحسین فراقی نے اپنی شاعری میں الفاظ کی اصوات اور کہیں کہیں ان کے نئے سیاق و سباق اور نئے تلازمات کی تعمیر کا بھی التزام کیا ہے۔ جس سے شعر کی تاثیر میں شدت اور معنی میں گہرائی پیدا ہوئی ہے۔"

(پروفیسر تحسین آفاقی)

"سننے میں فراقی دیکھنے میں وصالی اور پرکھنے پر مثالی، ظاہر میں مولویت ہی مولویت، باطن میں معنویت ہی معنویت، گفتگو نقرہ آمیز جستجو فکر انگیز سر کے باہر چاندی ہی چاندی، اندر سونا ہی سونا، بصیر پور میں پلے بڑھے اور پھر بصیر پور سے بصیرت پور کا سفر بڑی سرعت سے طے کر لیا۔ قصہ مختصر ہمارے موجودہ حالات میں ذرائع ابلاغ بلکہ ابلاگ کی لا نے ادیبوں، شاعروں کا ایک جم غفیر تیار کر ڈالا ہے جس میں اصلی اور نقلی کی پہچان ختم ہو کے رہ گئی ہے بلکہ اکثر جگہوں پہ تو نقل اصل سے بہتر نظر آنے لگی ہے کیونکہ یہاں بار بار بولا جانے والا جھوٹ سچ سے زیادہ خوشنما نظر آنے لگتا ہے۔ ادب کی حیثیت تو ایک دریا کی سی ہوتی ہے اور ذرائع ابلاغ اس میں سیلابی ریلے کا کردار ادا کرتے ہیں۔ دریا اور ریلے کی کشمکش میں جواہر ریزے نیچے بیٹھے رہتے ہیں اور خس و خاشاک جلد از جلد منزل پہ پہنچنے میں جتا نظر آتے ہیں، کم نظر لوگ انہی بہتے تنکوں کو دریا کا مقدر سمجھ لیتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں کسی ایسے ادبی پارکھ کی ضرورت ہوتی ہے جو خس و خاشاک کی ظاہری چمک دمک کو نظر انداز کر کے دریا کی طغیانیوں کی پروا نہ کرتے ہوئے سطح دریا سے جواہر پارے نکال لائے۔ آج یہ بات پورے یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ ادب سمندر میں ایسے غوطہ خور کا کردار ڈاکٹر تحسین فراقی ادا کر رہے ہیں۔"

(اشفاق احمد ورک)

"ڈاکٹر صاحب شاعری میں کلاسیکی روایت کے امین ہیں، وہ روایت جو میر، سودا، غالب، مومن، آتش، اقبال اور فیض صاحب سے ہوتی ہوئی ناصر کاظمی اور شہزاد احمد تک پہنچتی ہے۔۔۔ شاعری اُن کی شخصیت کی آئینہ دار ہے اور اس میں کوئی دورائے ہرگز نہیں ہے۔ اُن کی ذات زندگی اور ادب کے مختلف

شعبوں میں تقسیم ہے اگر وہ صرف شاعری کی طرف بھرپور توجہ کرتے تو بلاشبہ اُن کا شمار اردو کے بڑے شعرا میں ہوتا۔"

(نجیل احمد نجیل)

"ڈاکٹر تحسین فراقی کی شاعری وہ مدار ہے جو انسانی زندگی سے شروع اور اسی پر ختم ہے۔ اس میں مسکراہٹیں بھی ہیں اور تلخیاں بھی۔ کلام میں تغزل، تفکر، فلسفہ اور تصوف کے مضامین ایسے انداز میں پیش کیے گئے ہیں کہ ایسا لگتا ہے کہ زندگی کا کوئی نقش ایسا نہیں جو زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ ہو اور ڈاکٹر تحسین فراقی کے ہاں اس کی صدائے بازگشت نہ ملے۔ فکر و فن کی یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی بنا پر اردو کے جدید شعری منظر نامے کا ایک اہم نام ڈاکٹر تحسین فراقی ہیں۔

ایک ہمہ جہت شخصیت کے لیے یہ آسان کام نہیں کہ اس نے اپنی شاعری میں موضوعاتی تنوع پیدا کیا اور شاعری کے جدید منظر نامے پر وہ نقش چھوڑا جن کا عمر کبھی نگاہ بنی ہو۔ عربی، فارسی اور اردو کی علمی و ادبی روایات سے بھرپور آگہی کے ساتھ حزین شاعری قدیم و جدید کا حسین امتزاج ہے۔ فکر و فن کے عمدہ خصائص سے ان کی شاعری ان کو جدید شعرا میں منفرد مقام کا حامل بناتی ہے۔"

(شکیل احمد)

ڈاکٹر طارق ہاشمی اردو شاعری اور تنقید و تحقیق کے جدید منظر نامے میں ایک نہایت نمایاں نام ہے۔ آپ جی سی یونیورسٹی فیصل آباد کے شعبۂ اردو سے بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر وابستہ ہیں اور تحقیقی مجلہ ''زبان و ادب'' کے مدیر ہیں۔ آپ کے تحقیقی مضامین کثیر تعداد میں اردو کے معتبر جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ درج ذیل تصانیف آپ کی وسیع علمی و ادبی خدمات کی آئینہ دار ہیں:

شاعری:۔

دل دھواں سیا رہے، ایاز ع، اسلام آباد، 2002

دستک دیا دل، مثال پبلشرز، فیصل آباد، 2010

تنقید:۔

جدید نظم کی تیسری جہت، دستاویز، لاہور، 2002

اردو غزل ۔ نئی تشکیل، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 2008

فارغ بخاری ۔ شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، 2008

مولانا صلاح الدین احمد ۔ شخصیت اور فن، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 2011

شعریاتِ خیبر ۔ عصری تناظر، رومی پبلشرز، فیصل آباد، 2016

اردو نظم اور معاصر انسان، پورب، اسلام آباد، 2017

جدید غزل کا باب ظفر، رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی 2015

داغ دہلوی (مابعد نوآبادیاتی مطالعہ)، مثال پبلشرز، فیصل آباد، 2019

تدوین:۔

محاسنِ کلامِ غالب از ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری، مثال پبلشرز، فیصل آباد، 2010

ادب، علامت اور جمالِ متن، رنگِ ادب، کراچی 2019

9 789694 724805